فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوار ربانی	عصر کی قسم	افشاں نوید	8
قولِ نبیؐ	سود	حبیب الرحمٰن	12
خاص مضمون	خواتین کے حلقہ ہائے درس	ڈاکٹر آسیہ شبیر	17
نوائے شوق	نعت	عطاء الحق قاسمی	27
	قرآن اور مسلمان	معظم معین	27
	عجب یہ خوش گمانی ہے	نجمہ یاسمین یوسف	28
	غزل	حبیب الرحمٰن	28
	دعا وطن کیلئے	شبنم طارق	29
حقیقت و افسانہ	مسافر لوٹ آئے	ام ایمان	30
	کہاں آ کے رکنے تھے راستے	نصرت یوسف	34
	داستان دِل	فرحی نعیم	41
	کارساز	حمیرا بنتِ فرید	48
گوشہِ سیرت	نبیؐ کی ولادت اور بچپن	آسیہ راشد	50
سیر و سیاحت	نیویارک میں چند روز	صائمہ اسما	55
ہلکا پھلکا	جو کوئے یار سے نکلے	ربیعہ ندرت	60
	اب جن کے دیکھنے کو	ڈاکٹر رخسانہ جبین	62
سارا جہاں ہمارا	تاریخ کا عظیم ترین شخص	شہناز یونس	68
نہاں خانہِ دل	بتول دیارِ غیر میں	فریدہ خالد	70
محشرِ خیال	افشاں نوید، نجمہ یاسمین یوسف، کرامت بخاری، کرن یوسف، مریم فاروقی، خورشید بیگم		72
بتول میگزین	نازیہ خان، فریدہ ابوبکر، نسیم الٰہی		77
گوشہِ تسنیم	حفاظت کا حصار	بشریٰ تسنیم	80

ابتدا تیرے نام سے

قارئینِ کرام! چارسدہ میں یونیورسٹی پر دہشت گرد حملہ اور معصوم طلبا و اساتذہ کی ہلاکت ایک اور قومی سطح کا سانحہ ہے۔ایک اور بار مادرِ علمی اپنے ہی بچوں کے لہو سے بھر گئی.....قلم و قرطاس جن انگلیوں کے لمس سے حرارت پاتے تھے، انہی کے خون میں تر بتر ہو گئے .....حرف و صوت کی چہکار... خیال و آگہی کے پھوٹتے چشمے گولیوں سے خاموش کر دیے گئے...کہاں زندگی، خواب اور امنگیں.....کہاں وحشت، انتقام اور موت! سکول، کالج اور یونیورسٹیاں تو پھر نئے آنے والوں کی صداؤں سے گونجنے لگتی ہیں، مگر جس گھر سے ایک ہنستا مسکراتا بچہ ہمیشہ کے لیے چلا جاتا ہے اس گھر کی مسکراہٹیں اور خوشیاں کوئی واپس نہیں لا سکتا۔

درخت ماؤں کی مانند انتظار میں ہیں
طیور لوٹ کے آئے نہ آشیانوں میں

یوں لگتا ہے جیسے ہم ایک نہ ختم ہونے والی نحوست کا شکار ہو گئے ہیں۔ ہمارے بچے ایک مستقل خطرے کے زیرِ سایہ گھروں سے نکلتے ہیں۔ایک خوف نے ملکی فضا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔سیکیورٹی کے اقدامات کا مؤثر ہونا یقیناً ضروری ہے، ساتھ ہی اس صورتحال کی بڑی تصویر کو بھی سامنے رکھا جائے۔ خطے کی صورتحال میں عالمی طاقتوں کے مفادات کیا ہیں، ہمارے ہاں بدامنی اور خوف کی اس فضا سے کس کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟ ''دشمن'' کون ہے اور کہاں کہاں، کس کس شکل میں ہے؟ مکمل کامیابی اور امن کے لیے ان حقائق کا سامنے آنا بے حد اہم ہے۔ساتھ ہی عوام کے حوصلے بلند رکھنے اور امید کی فضا کو قائم رکھنے کے لیے اس بات کی بھی بہت اہمیت ہے کہ دہشت گردی پر قابو پانے میں نمایاں کامیابیوں سے عوام کو آگاہی دی جائے، اور انہیں اس آگاہی کے نتیجے میں یہ باور ہو کہ صورتحال ہمارے قابو میں ہے۔ایوب خاور کا ایک شعر:

یہ آرزو کہ کھِلے انگلیوں پہ عکسِ جمال
اس آرزو میں کہیں بات اختیار کی ہے

گزشتہ دنوں فرانسیسی ٹاپ ماڈل وکٹوئر ڈکسے کی کتاب منظرِ عام پر آئی ہے جس میں اس نے ماڈلنگ انڈسٹری میں عورتوں کے استحصال کی عبرت ناک تصویر کشی کی ہے۔فیشن کمپنیوں کے تقاضے پورے کرنے کے لیے سوکھے پن کا شکار ہونے والی اس ۲۳ سالہ ماڈل نے اٹھارہ سال کی عمر میں اس پیشے کو اختیار کیا اور محض پانچ برس میں ہی بلندیوں پر پہنچ جانے کے باوجود اسے چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے فرانس کی پارلیمنٹ کو اس بارے میں قانون سازی کرنے کے لیے خط لکھا جس کے نتیجے میں وہاں ایک قانون پاس کروانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ قانون صحت کو نقصان پہنچا کر ماڈلنگ کے تقاضے پورے کرنے پر پابندی لگائے گا۔اس سے پہلے اسرائیل میں ایسا ہی قانون بن چکا ہے، سپین، اٹلی، یو کے اور ڈنمارک میں ہلکے پھلکے قوانین موجود ہیں جبکہ امریکہ اور بیلجیم میں یہ کوششیں ناکامی کا منہ دیکھ چکی ہیں۔اہلِ مغرب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہاں فیشن کو ایک انڈسٹری کا درجہ دے کر عورتوں کے استحصال کی لامتناہی صورتوں کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔وہاں بچی ایک ایسے معاشرے میں پیدا ہوتی ہے جس میں عورت کی ہر ادا بکتی ہے۔اس کی سو طرح سے قیمت لگائی جاتی ہے اور اس کو تا عمر اسی میں الجھائے رکھا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ ایسی عمر کو پہنچ جائے جب اسے ناکارہ مال

کی طرح کونے میں پھینک دیا جائے۔اس وقت اس کی زندگی کو جس اولاد نے بامعنی بنانا تھا، وہ یا تو اس نے پیدا ہی نہیں کی ہوتی، یا بہت پہلے اس سے پیچھا چھڑا لیا ہوتا ہے۔اس طرزِ زندگی کے خوفناک نتائج سامنے آنے کے باوجود وہاں کے اہلِ دانش اپنے معاشروں کو ایسی نقصان دہ روش چھوڑنے پر مجبور نہیں کر سکے۔وجہ یہ کہ یہ معاشرے کمرشل ازم اور ملٹی نیشنلز کے پنجوں میں بری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔کوئی ایسی قانون سازی جس سے ان کے کاروباری مفادات پر ضرب پڑے، اس کی شدید مزاحمت کی جاتی ہے۔دُکسے نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ فیشن کی صنعت میں لبوں پر مہر رکھنے کا سخت اصول ہے، آپ ایسی باتیں کہہ کر وہاں نہیں رہ سکتے۔اور یہ کہ شروع کے وقتوں میں ماڈلز اصلی انسانوں کی طرح ہوتی تھیں مگر اب تو وہ بس لیبل کے پیچھے دھندلائی ہوئی ہوتی ہیں، اور ان سے جس قدر دبلا ہونے کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ محض کپڑوں کے ہینگرز بن کر رہ جاتی ہیں۔یہ مرد عورت کے درمیان کا کوئی جسم ہے جس کو آئیڈیل دکھایا جاتا ہے۔اس کا خیال ہے کہ مصنوعات کے اشتہارات لڑکیوں کو دبلے پن کا مریض بنانے میں بہت بڑا کردار ادا کر رہے ہیں، آپ ہر روز تواتر سے ایسے امیج دیکھتے ہیں تو خود بخود مان لیتے ہیں کہ خوبصورتی شدید دبلے پن ہی کا نام ہے اور پھر آپ ایک مریضانہ دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔دُکسے کے اعترافات اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس نمائشی اور جھوٹے طرزِ حیات کا وہاں عورتوں پر بے حد دباؤ ہے مگر وہ اس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں پاتیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ وہاں عورتوں کے حقوق کی نمائندہ تنظیمیں بھی عورت کی اس تذلیل پر خاموش ہیں۔حالانکہ ایسی قانون سازی کا مطالبہ خود ان کی طرف سے آنا چاہیئے۔ان سے زیادہ افسوس ہمارے ہاں ان عناصر پر ہے جو اس طرزِ زندگی کو میڈیا کی مدد سے ہمارے ہاں رواج دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

۵ فروری کو یومِ کشمیر کے طور پر منایا جاتا ہے۔بھارت کے غاصبانہ تسلط کے خلاف جانوں اور عصمتوں کے نذرانے دیتے ہماری اس مسلمان آبادی کو نصف صدی سے زائد عرصہ گزر گیا، انسانی حقوق کے غلغلے کے اس دور میں ایک پوری قوم کے انتخاب کا بنیادی حق غصب کر لیا گیا ہے، مگر ضمیرِ عالم سویا پڑا ہے۔اللہ ہمیں اس قابل بنائے کہ ہم اپنا یہ حق لے سکیں تا کہ کشمیری مسلمان صبحِ آزادی سے بہرہ مند ہوں۔

جید عالم دین، تفہیم الاحادیث سمیت کئی وقیع کتابوں کے مصنف مولانا عبدالوکیل علوی انتقال کر گئے۔اللہ مرحوم کی مساعیِ جمیلہ قبول کرے، ان کے کام کو ان کے حق میں صدقہ جاریہ بنائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے آمین۔

سردی کا موسم آیا بھی اور اب جانے کو بھی ہے۔جون ایلیا کی ایک چھوٹی سی نظم آپ کی نذر:

دھند چھائی ہوئی ہے جھیلوں پر　　اُڑ رہے ہیں پرند ٹیلوں پر
سب کا رخ ہے نشیمنوں کی طرف　　بستیوں کی طرف، بنوں کی طرف
اپنے گلّوں کو لے کے چرواہے　　سرحدی بستیوں میں جا پہنچے
دلِ ناکام میں کہاں جاؤں!　　اجنبی شام میں کہاں جاؤں!

بخیر و عافیت رہنے کی دعا کے ساتھ اگلے ماہ تک کے لیے اجازت بشرطِ زندگی!

صائمہ اسما

افشاں نوید

عصر کی قسم

والعصران الانسان لفی خسر الا الذین امنو و عملوالصلحت وتوا صو بالحق وتواصو بالصبر (العصر ۔ ۱ ۔ ۳)

ترجمہ: انسان درحقیقت خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

قرآن ہمیں بتا تا ہے کہ جو مذکورہ چار امور کی پروا نہیں کرر ہا حقیقی خسارے میں وہ ہے۔ اور ایمان کسی پوشیدہ خزانے کا نام نہیں نہ کسی مخفی روحانی کیفیت کا نام ہے جو حالت مراقبہ میں انسان کو لے جاتی ہو یا کوئی خانقاہی مزاج بناتی ہو۔ ایمان ایک محسوس حقیقت کا نام ہے۔ ایمان کا مظہر ہمیشہ عمل ہوگا۔ اور اللہ پر ایمان کا اظہار لامحالہ اللہ کی بندگی کی شکل میں ہی ہوگا اور ایمان ایک داخلی تبدیلی کا نام ہے جو لازماً اعمال صالح کی شکل میں اپنا اظہار کرتی ہے اعمال صالحہ میں صرف نیکی کرنا نہیں بلکہ برائی سے بچنا بھی شامل ہے اور سورہ العصر ہمیں تلقین کررہی ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ کے ثمرات کو صرف اپنی ذات تک محدود نہ رکھو اور تواحی بالحق لازم ہے خود اپنے ایمان کی آبیاری کے لئے بھی اور معاشرے کو فساد سے پاک کرنے کے لئے بھی۔ اور حق کی دعوت اور صبر میں بڑا گہرا رشتہ پایا جاتا ہے اور تواحی بالحق کے لئے پورے دین کے نظام کو قائم کرنا ناگزیر ہے۔

ہم میں سے بیشتر لوگ ایمان اور عمل صالح کو تو لازم خیال کرتے ہیں مگر تواحی بالحق کو جز وقتی کام سمجھتے ہیں اگر کرلیا تو سعادت نہ بھی کیا تو انفرادی نیکی اور تقویٰ بھی بخشوانے کے لئے کافی ہوگا۔ یہ ہماری کم فہمی کے سوا اور کچھ نہیں سوال یہ ہے کہ اگر یہ کام اتنا ناگزیر نہیں تو اس کے لئے اتنی کثیر تعداد میں انبیاً کیوں اتارے گئے اور انبیا کا اسوہ یہ بتا تا ہے کہ انہوں نے بھی اس کام کو جز وقتی نہیں کیا بلکہ روز وشب کیا اور اپنی ترجیحات میں ترجیح اول رکھا اور دس بیس برس نہیں بلکہ 900 برس بھی کیا اور اتنے طویل عرصہ کرنے کے بعد اللہ سے کوئی شکوہ بھی نہ کیا کہ اتنا برا معاشرہ ہے کہ اس دعوت پر لبیک کہنے والے بس کشتی بھر افراد ہی میسر آ سکے۔ بلکہ قرآن بتایا ہے کہ جب طوفانِ نوحؑ کا آغاز ہوگیا اس وقت بھی وقت کا پیغمبر پورے سوز وگداز اور مستقل مزاجی سے اسی کام میں لگا ہوا تھا۔ اسلام کا نظام فکر اور طریق کار وہ ہے جو ہم کو انبیا علیم السلام کی سیرتوں میں ملتا ہے۔ جن کے لئے قرآن نے کہا **اُولٰیک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ** (الانعام 90) ترجمہ: وہی لوگ تھے جن کی اللہ نے رہنمائی کی تھی لہٰذا انکی ہدایت کی پیروی کرو۔

لہٰذا ہم پابند ہیں کہ زندگی کے تمام معاملات کو اسی نظر سے دیکھیں جس سے انہوں نے دیکھا اور ہمارا معیار قدر وہی ہونا چاہیے جو ان کا تھا۔ بقول مولانا مودودیؒ ’’شیر اگر بکری کی سی بولی بولنے لگے اور بزغالوں کی طرح گھاس پر ٹوٹ پڑے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جنگل کی بادشاہی سے وہ آپ ہی دستبردار ہوگیا اب وہ اس کی توقع کیسے کرسکتا ہے کہ جنگل کے لوگ اس کی وہ حیثیت تسلیم کریں گے جو شیر کی ہونی چاہیے؟ خدا نے ہمیں اس سے بہت اونچا منصب دیا ہے ہمارا منصب یہ ہے کہ ہم کھڑے ہو کر تمام دنیا سے غیر اللہ کی حاکمیت مٹا دیں اور خدا کے بندوں پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت باقی نہ رہنے دیں۔ یہ شیر کا منصب ہے اور اس منصب کو ادا کرنے کے لئے کسی قسم کی خارجی شرائط درکار نہیں ہیں، بلکہ صرف شیر کا دل درکار ہے وہ شیر، شیر نہیں ہے جو آ کر پنجرے میں بند ہو تو بکری کی طرح ممیانے لگے اور شیر وہ بھی نہیں جو بکریوں کی کثرت تعداد دیکھ کر یا بھیڑیوں کی چیرہ دستی دیکھ کر اپنی شیریت بھول جائے۔‘‘

(تحریک آزادی ہند اور مسلمان حصہ دوم ص:108)

سوال یہ ہے کہ جس چیز کو ہمارے دل اور دماغ حق سمجھتے ہیں اس کے لئے ہم کتنی جان و مال اور اوقات کی قربانی دینے کو تیار ہیں؟ سورہ العصر ہمارے بچے بچے کو یاد ہے لیکن نہ اس کے معنی ومفہوم پر ہم غور کرتے ہیں نہ اس کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کرتے اور انکو اپنی زندگی پر لاگو کرتے ہیں اور چند نیک اعمال کو اپنی نجات کے لئے کافی گردانتے ہیں جبکہ قرآن واضح لفظوں میں کہتا ہے کہ ''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائیگا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جوان سے پہلے گزرے ہیں اللہ کو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون (العنکبوت۔۲)''

تو احی بالحق کوئی مشغلہ بھی نہیں ہے نہ پارٹ ٹائم جاب۔ اگر آپ کسی کو توجہ دلائیں کہ فریضہ اقامت دین زندگی کے لازمی فرائض میں سے ہے کی وجہ جس رب نے نماز کو فرض کیا روزے، زکوٰۃ اور حج کو فرض اسی رب نے اسی قرآن میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو بھی فریضہ قرار دیا۔ لوگوں کی اکثریت کے پاس اسکا جواب بس اسی قدر ہوگا کہ ہاں اس فریضے کی اہمیت سے تو انکار نہیں ہے مگر فی الحال حالات اجازت نہیں دیتے، صحت اجازت نہیں دیتی، خانگی امور اجازت نہیں دیتے وغیرہ وغیرہ۔

سید اسعد گیلانی (اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے) ان عذرات کا بڑی دردمندی سے جواب دیتے ہیں فرماتے ہیں کہ

''ہو سکے تو کبھی کبھار محلے کے قبرستان بھی ہو آیا کرو وہاں بڑے بڑے کاروباری اپنا کاروبار حیات سمیٹ کر پڑے ہیں، ان کے مکانات تمہارے اپنے محلے میں ہیں جن کے گرنے یا کھڑے رہنے کی طرف سے وہ ایسے بے نیاز ہیں جیسے انہوں نے کبھی یہ بنائے ہی نہ تھے۔ ان کے کاروبار تمہاری بستی میں اب بھی چل رہے ہیں۔ لیکن جن کا گمان تھا کہ ان کے بغیر یہ کاروبار نہ چلیں گے۔ کاروبار چل رہے ہیں لیکن وہ کاروبار کے ساتھ نہ چل سکے۔ جنہیں لمحہ بھر فرصت نہ ملتی تھی اب انہیں تا قیامت فرصت ہی فرصت ہے، کاروبار سے بھی اور عمل سے بھی اس لئے کہ دنیا کی امتحان گاہ میں یہی تو مقابلہ تھا کہ کاروبار دنیا کے اندر رہ کر عمل کیسے کیا جائے اور عمل کرتے ہوئے کاروبار دنیا کو کیسے نبھایا جائے۔ دونوں میں سے کوئی ایک بھی شے مطلوب نہ تھی۔ اگر ہوتی تو امکان ہی کیوں ہوتا؟ اس لئے چند دن اس شہر خموشاں کا علی الصبح یا سر شام دورہ رکھو۔ انکی قبروں کا حال دیکھو ان کے کتبے پڑھو۔ ان سے علیک سلیک کرو اور آخرت کی عدالت لگنے تک عدالت کے احاطے میں انکے صدیوں کے انتظار کا رحال دیکھو۔ غور کرو کہ اس قطار میں کھڑے ہونے کے لئے ہم تم بھی قبرستان کے اس جم غفیر کی طرف رواں دواں چلے جا رہے ہیں۔'' (قافلۂ سخت جان)

شیطان کی ایک اکساہٹ یہ بھی ہوتی ہے کہ اتنے کام کا نتیجہ کیا نکلا۔ چونکہ یہ ایک تھکا دینے والا کام ہے اور اکثر نتائج وہ نہیں نکلتے جو ہم اپنی دنیاوی کوششوں کے دیکھتے ہیں اس لیے ایک داعی مایوس ہو جاتا ہے اور صبر واستقامت کی کمی بے اعتمادی میں تبدیل ہوتی چلی جاتی ہے جبکہ کسان اپنی فصل کے اچھی نہ ہونے پر کبھی زمین کو مورد الزام نہیں ٹھہراتا اسی لیے قرآن نے واضح کیا کہ حق کی نصیحت کے باب میں لازماً صبر کرنا پڑے گا۔ ایک نہیں کئی کئی حوالوں سے صبر کرنا ہوگا۔ اور یہ ساری زندگی کا جہاد ہے۔ پوری زندگی کا اسائنمنٹ ہے، ایمان کی گواہی عمل صالح اور حق کی نصیحت سے ہی ناپی جائیگی۔ اور قیامت کے روز گردن چھڑانے کے خواہش مند ہیں تو اس کے سوا کوئی ٹھنڈی سڑک جنت تک نہیں جاتی۔

مکی زندگی کے تیرہ برس کیا اللہ کے رسولؐ اور آپکے اصحاب کے لئے آزمائشوں کے حساب سے تیرہ صدیوں سے کم تھے بھلا؟ مگر ان آزمائشوں میں صبر کرنے پر بھی آپؐ کے اصحاب افق کے روشن تارے بن کر جلوہ گر ہوئے۔ آزمائشوں کی بھٹی میں پک کر ہی شخصیتیں کندن بنتی ہیں اور جان رکھیے کہ ہر ایک کے لئے یہ آزمائشیں بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔ اور اتنی سخت ہوتی ہیں یہ آزمائشیں بسا اوقات کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے ساتھی بار بار پکار اٹھتے تھے کہ ''متیٰ نصر اللہ'' اللہ کی مدد کب آئیگی۔

اور یہ سوال اپنی کھیتی باڑیوں میں مشغول، اپنے پرسکون گھروں میں عیش میں مگن لوگوں کا سوال نہ تھا بلکہ ان لوگوں کا سوال تھا جن کی تلواریں نیاموں میں کم ہی ٹھہرتی تھیں جنکے گھوڑوں کی ٹاپوں سے دشت دھل جاتے تھے، جو ہر لمحہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کی دھن میں مگن رہتے تھے اور اس راہ میں اپنا سب کچھ لگا دینا ہی اپنی کامیابی گردانتے تھے۔ انبیا کے ساتھیوں نے کامل ایمان اور صبر و استقامت کی بہترین مثالیں قائم کی ہیں رہتی دنیا تک کے اہل ایمان کے لئے۔ حقیقتاً انکا ہر عمل دعوت کی پکار تھا اور وہ ایمان کی پوشیدہ قوتوں سے آگاہ تھے اور یہی اللہ کے نبیؐ کا طریقہ کار تھا کہ جو بھی ایمان لایا اس کو تزکیہ اور اصلاح کے لئے کسی خانقاہ میں نہیں بھیجا نہ مراقبوں کا طریقہ سکھایا بلکہ ایمان واعتقاد کی درستگی کے بعد فوراً دعوت دین کے کام میں لگا دیا جس میں آپ خود مصروف تھے یعنی نظام باطل سے کشمکش، یہ بھٹی خود میل کچیل چھانٹ چھانٹ کر الگ کر دیتی ہے اور اس بھٹی میں پڑنے والا بالآخر کندن بن ہی نکلتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد اس کے عملی تقاضوں کو پورے شعور سے سمجھا جائے اور واپسی کی کشتیاں جلا کر اس ساحل پر قدم رکھا جائے۔

سید اسعد گیلانی کے ان سچے لفظوں کی مہک آج بھی ہمارے جذبوں کو مہمیز دیتی ہے کہ

''یہ تو سوچو! کہ جس راہ پر چلنے کا عزم رکھتے ہو اس راہ پر ایسے ایسے راہ رو گزر چکے ہیں جنہوں نے اگر 900 سال تک دعوت دین کا کام بے ثمر کیا ہے تو بھی مایوس نہیں ہوئے۔ اس لئے کہ زمین کے مالک نے جیسی زمین دی تھی، مزراع نے اسی کے اندر ہل چلانا تھا۔ ہمارا کام تو اس کی زمین میں ہل چلاتے رہنا ہے، شور زمین میں کچھ پیداوار نہ ہوئی تو مالک خوب جانتا ہے کہ اس کے نوکر نے محنت کی یا نہیں کی اور فصل نہیں ہوئی تو اس میں کسان کی محنت کا قصور ہے یا زمین کے شور کا۔ تم نے خدا کے اس نیک بندے کا نام تو سنا ہی ہوگا جنہیں حضرت ایوبؑ کہتے ہیں برسوں تک بیماری میں مبتلا رہنے اور بدترین تکلیف دہ حالات گزارنے کے بعد جب انہیں کہا گیا کہ وہ اپنے مالک سے اپنی بیماری اور تکلیف کو دور کرنے کے لئے دعا کریں تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے اپنے مالک سے شرم آتی ہے جس نے عمر بھر خوش وخرم اور خوشحال رکھا، اب ابتلا کے چند ایام پر بے صبر ہو کر اس کے احسانات کیسے بھول جاؤں۔ مالک خوب جانتا ہے کہ اس کا بندہ کس حال میں ہے اور وہ اپنے بندے کے لئے کافی ہے۔ مالک کا شکر کرو کہ اس نے کامیابی کو اجر کا مدار نہیں قرار دیا بلکہ اجر کی ابتدا نیت سے کی اور مومن کی دل شکستگی پر اسے دہرے اجر کی خوشخبری سنائی۔

''تم نے ویت نام والوں کو دیکھا جو اپنے خدا سے کسی اجر کی توقع نہیں رکھتے تھے لیکن محض زمین کے ٹیلوں، باغوں، کھیتوں، کارخانوں اور جنگلوں تک کے لئے پیہم لڑنے اور ہزار سال تک نسل در نسل لڑنے کا داعیہ رکھتے تھے۔ اگر نفس کا بندہ انسان درختوں، ٹیلوں، پہاڑوں اور دریاؤں کے لئے صدیوں تک لڑنے کا داعیہ رکھ سکتا ہے تو خدا کا بندہ مومن اپنے مالک کے لئے باطل کے خلاف زندگی بھر لڑنے اور کبھی نہ جھکنے کا عزم کیوں نہیں رکھ سکتا؟'' (قافلۂ سخت جان)

امام طبریؒ نے روایت کیا ہے کہ مقداد بن الاسود کو حمص میں ایک تابوت کے کنارے کھڑے دیکھا کہ اپنے موٹے اور بھاری جسم کے لئے تابوت کا آرڈر دے رہے ہیں پوچھا گیا خیریت ہے؟ جواب دیا۔ جہاد کی تیاری ہے۔ کہا گیا اللہ نے آپکا عذر (بے حد موٹاپا) قبول کر رکھا ہے کیا ''ہمارے پاس آیت آچکی ہے، **انفروخفافاو ثقالا**''

سعید بن المسیبؒ کی ایک آنکھ جنگ کی نذر ہو چکی تھی ان سے کہا گیا اب آپ آرام کیجئے ''نکلنے کو اور بہت سے لوگ موجود ہیں فرمایا اللہ نے خفیف اور ثقیل ہر شخص کو نکلنے کو کہا ہے جنگ نہ بھی کر سکا تو مسلمانوں کے گروہ میں اضافے ہی کا سبب بن جاؤنگا اور محاذ جنگ پر ان کے سامان ہی کی حفاظت کرلونگا۔''

ابراہیم بن ادھم نے محسوس کیا کہ موت قریب ہے فرمایا ''میری کمان پر تیر چڑھا دو'' اس حال میں انتقال ہوا کہ انکے ہاتھ میں وہ کمان مضبوطی سے جکڑی ہوئی تھی (تاریخ دمشق علامہ ابن عساکر)

اللہ کے نبیؐ مرض الموت میں جس وقت مبتلا تھے شدید تکلیف میں صحابہ کرام کو یاد دہانی کرا رہے ہیں کہ ''اسامہؓ کے لشکر کو روانہ کردو'' آپؐ

کے یار غار صدیق اکبرؓ کی آخری وصیت ملاحظہ کیجئے ''عمرؓ میں تم سے ایک بات کہتا ہوں مجھے امید ہے کہ میں آج پیر کے روز مر جاؤں گا چنانچہ جب میں مر جاؤں تو تم شام سے پہلے لوگوں کو امیر لشکر کے ساتھ جانے کے لئے تیار کرنا اور آگر مجھے شام تک دیر ہو جائے تو صبح کا انتظار مت کرنا۔''

مشہور شاعر نابغۃ الجعدی نے اپنی اہلیہ سے جب کہ وہ انہیں راہ خدا میں نکلنے سے روک رہی تھیں عربی اشعار کہے جنکا ترجمہ یہ ہے۔

سن اے ہمدم! اگر اللہ تو کیا اللہ کو میں روک دونگا
نکالے

کتابی آیتیں شکوہ کرینگی تو پھر میں اپنے رب سے کیا
کہوں گا

میں لنگڑا اور اندھا تو نہیں کہ میرا عذر مجھ کو روک پائے
ہوں

جسے کوئی بھی بیماری نہ ہو تو وہ میدانِ وغا میں کیوں نہ
جائے!

☆.....☆.....☆

سود

ہر بات پر گفتگو کرنے سے قبل اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے معنی و مطالب کو اچھی طرح سمجھا جائے۔ سود ہے کیا؟ اسلامی تعلیمات میں سود کے کیا احکامات ہیں؟

عام فہم زبان میں ''سود'' ''منافع'' کو کہا جاتا ہے لیکن ہر منافع نہ تو جائز ہوسکتا ہے اور نہ اس کو ناجائز کہا جاسکتا ہے۔ ایسا منافع جو کسی محنت بنا اور نقصان کے خطرے کے بغیر نہ صرف حاصل ہو بلکہ جس سے اس منافع کو حاصل کیا جارہا ہو وہ پابند ہو اس بات کا کہ وہ خواہ مرہی کیوں نہ رہا ہو، اس کو منافع کی وہ رقم ہر صورت ادا کرنی ہے، اس کو ''سود'' کہا جا سکتا ہے۔

گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے ہم قرآن اور حدیث کی روشنی میں اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات میں سود کہا کس کو جاتا ہے۔

''سورۃ البقرہ، آیات 281-278، اے ایمان والو! چھوڑ دو جو کچھ سود میں سے باقی رہ گیا ہے اگر تم مومن ہو۔ اور اگر نہیں چھوڑتے تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور اگر توبہ کرتے ہو تو تمہارے لیے ہے تمہارا اصل مال۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔ اگر مقروض تنگ دست ہو تو اسے ادائیگی تک سہولت دو اور اگر بخش دو تو یہ تمہارے حق میں بہت اچھا ہے اگر تم سمجھو اور ڈرتے رہو اس دن سے جس دن لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف پھر پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں ہوگا۔''

یہ آیت اسی جانب اشارہ کر رہی ہے کہ اس منافع کے حصول کے لئے اس حد تک نہ جاؤ کہ قرض لینے والے کے پاس مر جانے کے علاوہ اور کوئی راستہ ہی نہ رہے اور اصول وضع کیا جارہا ہے کہ دراصل تمہارا مال وہی ہے جو تم نے کسی کو دیا تھا۔ ایک وہ منافع ہوتا ہے جس کو تعلق تجارت میں شرکت سے ہوتا ہے۔ وہ سراسر جائز اور حلال ہے اور اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان کچھ یوں ہے۔

''سورۃ البقرہ، آیات 276-275، جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے مگر جس طرح اٹھتا ہے وہ شخص جس کے حواس کھو دیئے ہوں شیطان نے لپٹ کر۔ یہ حالت ان کی ہے جو کہتے ہیں کہ تجارت بھی تو ایسی ہی ہے جیسے سود لینا، حالانکہ اللہ نے حلال کیا ہے تجارت کو اور حرام کیا ہے سود کو۔ تو جس کو پہنچی یہ نصیحت اس کے رب کی طرف سے اور وہ باز آ گیا تو اس کے لئے جو پہلے لے چکا اس کا معاملہ اللہ کے حوالے، اور کوئی پھر سود لیگا، وہی لوگ ہیں دوزخ والے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ مٹاتا ہے اللہ سود کو اور بڑھاتا ہے اللہ خیرات کو اور اللہ پسند نہیں کرتا ناشکر گزاری کرنے والے گناہ گار کو۔''

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تجارت کے سلسلے میں اگر کسی کی رقم شامل ہو تو اسے (اسے معاہدے کے مطابق) اپنا منافع لینے کا پورے کا پورا حق حاصل ہے۔ اس حکم پر کچھ لعینوں نے مضحکہ خیز انداز میں یہ نقطہ اٹھایا کہ لو وہ بھی تو سود ہی کی شکل ہوئی جس پر اللہ تعالیٰ کا حکم آیا کہ نہیں وہ ''سود'' نہیں ہے۔ وہ منافع اس لئے سود نہیں ہے کہ اس میں نقصان ہونے کا خدشہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے جبکہ سود کی ادائیگی ہر صورت لازم ہے اور سود کی رقم مقرر بھی نہیں ہوتی اس میں اضافے پر اضافہ ہی ہوتا

رہتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں، افراد اور اداروں کے لئے یہ وعید بھی رکھی کہ اگر وہ سودی لین دین سے باز نہ آئے تو ان کے ساتھ کچھ ہو سکتا ہے۔ آخرت میں تو جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہونا ہی ہے، اس دنیا میں بھی وہ بہت مشکل کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

''سورۃ النساء آیات 161-160 پس یہود کے ظلم کی وجہ سے ہم نے ان پر پاکیزہ چیزیں حرام کیں جو پہلے ان پر حلال تھیں اور اس وجہ سے کہ وہ اللہ کے راستے میں روکتے تھے بہت زیادہ اور اس وجہ سے کہ وہ سود لیتے تھے، حالانکہ ان کو اس سے منع کیا گیا تھا اور اس وجہ سے کہ لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے اور تیار کر رکھا ہے ہم نے ان میں سے کافروں کے لئے دردناک عذاب۔''

اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ یہودیوں پر بھی سود حرام قرار دیا گیا تھا لیکن انہوں نے اس کی پرواہ نہیں کی اور حرام خوری پر کمر بستہ رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسی بہت سی حلال چیزیں جو پہلے ان پر حلال تھیں، ان کو حرام قرار دے دیا تھا۔

بے شکاب کیونکہ اللہ کے احکامات مکمل ہو چکے ہیں اور وحی کا سلسلہ بھی بند ہو چکا ہے لیکن اللہ کا حکم اپنی جگہ قائم ہے۔ مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ جو لوگ اللہ کے احکامات کی مسلسل خلاف ورزی پر کمر بستہ رہتے ہیں ان پر ایسا وقت بھی ضرور آتا ہے کہ دنیا کی ہر نعمت ان کی نہ صرف دسترس میں ہوتی ہے بلکہ ان کے عزیز و اقارب، رشتے دار بال بچے ان سے خوشامد کر رہے ہوتے ہیں کہ آپ یہ اور یہ چیزیں کھا لیں لیکن اللہ نے ان کے نصیب سے وہ تمام چیزیں نکال دی ہوتی ہیں۔ ان کو ایسی ایسی بیماریوں نے جکڑ لیا ہوتا ہے کہ بیشمار حلال چیزیں ان پر حرام ہو چکی ہوتی ہیں اور ان کے لئے زہر قاتل بن جاتی ہیں اور یہ سب ان کی بداعمالیوں کا سبب ہوتی ہیں جن میں سود ہر صورت میں اول ہے۔۔

انسان اصل میں سامنے کی جانب دیکھ رہا ہوتا ہے اور وہ اس بات کو فراموش کر بیٹھا ہے کہ جب وہ سامنے کی طرف دیکھ رہا ہوتا ہے تو اس کے دائیں بائیں اور خاص طور پر اس کے پیچھے قریب قریب 75 فیصد وہ علاقہ ہوتا ہے جس کو وہ نہیں دیکھ رہا ہوتا۔ اپنے سامنے کا تو ہر خطر، ہر منافع، ہر برا اور ہر بھلا اس کو خوب نظر آ رہا ہوتا ہے لیکن جو کچھ وہ نہیں دیکھ پاتا اس خطر، اچھے اور برے سے اس کو کون بچا رہا ہوتا ہے؟، وہ اس سے بے خبر ہی رہتا ہے۔ اسی طرح جو منافع (سود) اس کے سامنے ہوتا ہے وہ تو اسے بہت ہی اچھا اور بھلا لگ رہا ہوتا ہے لیکن اس میں سے اس کے رب نے کیا کیا خباثتیں رکھ دی ہیں، یہ اس کی سوچ سے بھی آگے کی چیزیں ہوتی ہیں۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

''سورۃ الآعمران: آیت 130، اے ایمان والو مت کھاؤ سود بڑھتا چڑھتا، اور اللہ کی نافرمانی سے بچو تا کہ تم کامیاب ہو سکو، بچو اس آگ سے جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے۔''

سورۃ الروم، آیت 39، تم جو مال دیتے ہو سود پر کہ بڑھتا رہے لوگوں کے مال میں، سو وہ نہیں بڑھتا اللہ کے ہاں اور جو دیتے ہو زکوٰۃ کے طور پر تا کہ اللہ کی رضا حاصل کرو، تو ایسے مال بڑھتے رہیں گے۔''

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سود سے (لینے سے) مال نہیں بڑھا کرتا، مال خرچ کرنے (زکوٰۃ) سے بڑھتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات کی روشنی میں ''سود'' کی تعریف میں جو نقاط سامنے آتے ہیں وہ کچھ اس طرح سے ہیں کہ

1۔ ایسا مال جو محض اس لئے دیا جائے کہ وہ بڑھتا رہے گا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں نہ تو پسندیدہ ہے اور نہ ہی اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ البتہ ایسا مال جو ''زکوٰۃ'' کے طور پر دیا جاتا ہے اللہ کے نزدیک یہ فعل پسندیدہ بھی ہے اور اس میں اس کے ہاں اضافہ در اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ نے سختی کے ساتھ یہ حکم دیا ہے کہ ''سود'' مت کھاؤ۔ اب کوئی سوچے کہ جس رب نے ہم کو پیدا کیا ہے اور اس نے دنیا کی ہر نعمت سے ہمیں نوازا ہے اور وہی عظیم ہستی ہمیں ''سود'' سے بچنے کا حکم دے رہی ہے تو ہم پر اس سے بچے رہنا کتنا فرض ہے جبکہ وہ یہ بھی فرما رہا ہو کہ نہ بچے رہنے کی صورت میں سخت سزا بھی ملے گی۔

3۔ یہود پر اسی سود کی لعنت کی وجہ سے کچھ حلال چیزوں کو بھی حرام کر دیا گیا تھا، تو کیا سود کھانے کی وجہ سے ہماری حلال چزیں ''حلال''

کہلائیں گی؟

4۔اللہ تعالیٰ صاف صاف سود کہ نہ صرف حرام قرار دیا ہے بلکہ جولوگ ایسا کریں گے وہ سخت ترین سزا کے مستحق بھی ہونگے۔

5۔اور اگر کسی پر ہمارے سود کی رقم واجب بھی رہ گئی ہو تو اللہ کا حکم ہے کہ اس رقم کو فوری طور پر معاف کر دیا جائے اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو اللہ کے عذاب کو اپنے لئے تیار سمجھنا چاہیے۔

حدیث میں آیا ہے کہ ''حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے لعنت فرمائی ہے سود لینے اور سود کھانے والے پر اور سود دینے اور کھلانے والے پر اور اس کے لکھنے والے پر اور اسکے گواہوں پر اور فرمایا (گناہ کی شرکت میں) ''یہ سب برابر ہیں۔'' (مسلم)

اس حدیث کی روشنی میں اگر آج کل کے ''نظامِ بینک کاری'' کو سامنے رکھا جائے تو ایسے تمام افراد جنہوں نے اس نظام کو وضع کیا، جولوگ ان کے سہولت کار ہیں، جولوگ اس میں اپنے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، جولوگ اس میں اپنے رقوم جمع کراتے ہیں اور جو افراد اس سے قرض لیکر اس سے اپنے روزگار کا بندوبست کرتے ہیں، سارے کے سارے شیطانی کام میں ملوث ہیں اور اپنے اپنے حصے کی سزا کے مستحق ہیں۔

یہ تو وہ باتیں ہیں جو سود کی تشریحات اور سود کی تعریف کا تعین کرتی ہیں۔

ہم جس معاشرے میں پرورش پا رہے ہیں، قریب و دور اس بات کو کہیں سے کہیں بھی نہیں دیکھ پا رہے ہیں کہ اس لعنت سے فوری نجات کا کوئی راستہ نظر آ رہا ہو۔

سود سے بچنے کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہم اپنی رقوم کو بینک میں جمع ہی نہ کرائیں لیکن یہاں یہ تو ممکن ہے کہ مجھ جیسا ''ہزاروں یا لاکھوں'' میں تجارت یا لین دین کرنیوالا تو ایسا کر سکتا ہوگا لیکن وہ افراد جن کا حساب کتاب کروڑ اور کھربوں میں ہے اس کے لئے اتنی بڑی رقم کو اپنے پاس رکھ کر محفوظ سمجھنا، اس کی ترسیل کرنا اور اس کو اپنے ملک سے باہر ''اصل'' شکل صورت میں منتقل کرنا سو فیصد ناممکن ہے۔ جہاں تک اپنے ہی گھر میں اتنی بڑی بڑی رقوم کو رکھنے میں بیشمار قانونی پیچیدگیاں ہیں وہیں چوروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ رکھنا بھی ایک امر محال ہے اور بیرون ملک تجارت کی صورت میں یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ اپنے ملک کی کرنسی کے صندوق کے صندوق کسی دوسرے ملک منتقل کر سکیں اس کام کے لئے آپ کو ہر صورت بینکوں کا سہارا لینا پڑے گا اور اس طرح آپ کی ''حلال رقم'' حرام ہو کر رہ جائے گی۔

سود سے بچے رہنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ہم جو بھی کاروبار کریں وہ ''شراکت داری'' پر کریں، جس میں جہاں آپ منافع لینے کا حق رکھتے ہوں وہاں پھر آپ کسی کے نقصان میں بھی برابر کے شریک ہوں۔

اس بات پر عمل بھی شاید اس دور میں ممکن نہیں رہا۔ اس کے لئے یہ بات اشد ضروری ہے کہ معاشرہ اس حد تک ایماندار ہو کہ اس کا ایک ایک بچہ اتنا سچا اور نیک ہو کہ وہ جھوٹ کے متعلق سوچے بھی تو اس کا رواں رواں کانپ کر رہ جائے اور یہ بات فی زمانہ ممکنات میں سے نظر نہیں آتی۔ جب تک معاشرہ پاکیزہ نیک اور صلاح نہیں ہو جاتا یہ بات کیسے ممکن ہے کہ بسلسلہ تجارت یا کاروبار، رقم لینے والا یا والے اپنے نفع نقصان کے گوشوارے سو فیصد درست رکھیں گے؟ امکان اسی بات کا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے گوشواروں میں ''نقصان ہی نقصان'' درج کریں گے اور جس نے بھی از راہ عنایت ان کو قرض دیا ہوگا اس کو دیوالیہ کرنے میں کبھی بھی کوئی کثر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ ہم جس ملک میں رہتے ہیں اس کے جغرافیائی اور اقتصادی حالات کو سامنے رکھنا بھی بے حد ضروری ہے۔

ایک تو یہ بات ہے کہ آئندہ آنے والے برسوں میں جغرافیائی صورت حال کیا رخ اختیار کرتی ہے اس کے متعلق بدقسمتی سے کوئی بات بھی یقینی نہیں ہے نیز یہ کہ اقتصادی اعتبار سے ہم روز اول سے ہی انحطاط کا شکار ہوتے آ رہے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے روپے کی قدر میں بہت تیز رفتاری کے ساتھ کمی واقع ہوتی جا رہی ہے۔ جب پاکستان بنا تھا تو ڈالر شاید صرف ''سات روپے'' کا تھا اور اب ''ایک سو سات

روپے'' کا فروخت ہورہا ہے اوراس پر بھی نہیں معلوم کہ اس کے پر ''کترے'' بھی جاسکیں ے کہ نہیں اور یہ آئندہ آنے والے برسوں میں کون سی پستی تک جا پہنچے گا۔

اب ذرا سوچیں ! اگر میں آپ سے زیادہ نہیں صرف ''ایک لاکھ روپے'' لوں اور وعدہ کروں کہ آپ کو آئندہ سال لوٹا دونگا ، اور نہ لوٹا سکوں اور دس پندرہ برس بعد لوٹاؤں تو آپ اس رقم کو لے کر کیا کریں گے نیز یہ کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں میرے لئے جو پابندی ہے وہ تو ''اصل رقم'' ہی ہے (تو کیا ایسا ہی ہے؟)

جب کوئی چیز حد سے زیادہ بگڑ جاتی ہے تو اس کو اس کی اصل شکل میں سنوارنا بے حد دشوار ہو جاتا ہے ، یہی حال فی زمانہ ہمارے نظام بینک کاری اور سود کے لین دین کا ہے۔

لیکن کیا کوئی کام دشوار ہو جائے تو اس کو درست کرنے کی سعی نہیں کرنی چاہئے؟ بالکل غلط ، جب تک ہم ہر قسم کے غلط کام کو درست نہیں کریں گے یا درستگی کی جانب لے کر نہیں جائیں گے ہم کامیابی اور کامرانی کی بجائے تباہی اور بربادی کی جانب بڑھتے رہیں گے اور ایک دن وہ آئے گا کہ ہمارا نام ونشان تک مٹ جائے گا۔

کسی بھی عمل یا نظام کو برا رکہنا یا اس کو برا ثابت کرنا دنیا کا آسان ترین کام ہے۔

اگر ہم موجودہ ''نظام بینکاری'' کو دیکھیں تو یہ ایک نعمت عظمیٰ سے کسی طور پر بھی کام نہیں ، آپ کی رقم کا تحفظ ، اس کی ترسیل ، ملک کے اندر باہر بھاری بھاری رقوم کا تبادلہ بنا کسی جھنجھٹ اور تفکر ہو جانا وغیرہ جیسے کام بغیر کوئی وقت ضائع ہو جانا جیسے بے شمار امور ایسے ہیں جو بلاشبہ ایک نعمت سے کم نہیں ۔ اگر اس میں سے کسی ''سودی'' لین دین کو نکال لیا جائے تو یقیناً یہ نظام ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا ۔ غیر سودی نظام میں سب سے بڑی رکاوٹ معاشرے کا اخلاقی انحطاط ہے ، جس سے معاشرے سے سچائی ، ایمانداری اور اللہ کا ڈر اور خوف مفقود ہو جائے وہاں ''سود'' ایک لعنت کے طور پر مسلط ہو جاتا ہے۔

سود کو ختم کرنے کا ایک معروف طریقہ ہر قسم کے لین دین میں ''شراکت داری'' ہوسکتا ہے لیکن اس کے لئے جو بہت ضروری بات ہے وہ ہے پاکیزہ اور اللہ تعالیٰ سے ڈر اور خوف رکھنے والا معاشرہ ، ایسے ہی معاشرے میں باہمی اعتماد پیدا ہوسکتا ہے اور یہ باہمی اعتماد ہی شراکت داری جیسے اصول کو پروان چڑھا سکتا ہے اور منافع کی ایماندارانہ تقسیم کا سبب بن سکتا ہے۔ یہ تو وہ طریقہ جس کے ذریعے ایماندارانہ تجارت کو فروغ مل سکتا ہے اور کسی بھی معاشرے کی ترقی وخوشحالی کا سبب بن سکتا ہے۔ شراکت داری کا معاملہ تو زیادہ تر تجارت سے وابستہ ہوتا ہے لیکن کچھ معاملات یا لین دین صرف اور صرف ''فرض'' سے وابستہ ہوتے ہیں ، قرض ایسا لین دین ہے جو کسی کو بھی کسی وقت درپیش ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں قرض لینے والا کسی بھی شراکت کے بغیر اپنی لی ہوئی رقم اپنے وعدے پر اتارنے کا پابند ہوتا ہے۔ یہ پابندی چند دنوں ، ہفتوں اور مہینوں کی بھی ہوسکتی ہے اور بعض اوقات کئی برسوں پر بھی مشتمل ہوسکتی ہے۔ عالم طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جتنی رقم ادھار لی جائے ، برسوں بعد بھی قرض لینے والا اتنی ہی رقم اتارنے کا پابند ہوتا ہے۔ لیکن..... مسئلہ یہ ہے کہ برسوں بعد اس رقم کی ''قدر'' بہت گر چکی ہوتی ہے اس طرح وہ فرد جس نے کسی کو قرض دیا ہوا ہوتا اس کو شدید نقصان کا سامنا ہوتا ہے اور شاید یہی وجہ یا کہ اول تو قرض دینے والا قرض دیتے ہوئے ہچکچاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے یا پھر وہ ''سود'' کی جانب مائل ہو جاتا ہے جو ہر صورت میں حرام اور سخت گناہ کی بات ہے۔

میرے نزدیک اس کا ایک حل ہے اور میں علمائے کرام سے اس سلسلے میں رائے لینا چاہونگا اور مجھے یقین ہے کہ وہ نہ صرف اس بات پر غور کریں گے بلکہ امید ہے کہ وہ میری تائید بھی کریں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو بھی رقم کسی کو دی جائے اس کی قدر کا تعین کسی دوسرے شے سے کرلیا جائے۔

مثلاً ، اس وقت کے گولڈ ریٹ سے ، کسی مستحکم ملک کی کرنسی سے ، گندم یا آٹے کی قیمت سے ، وغیرہ وغیرہ۔ یوں سمجھ لیا جائے کہ میری یہ رقم اتنے تولے سونے کی قیمت کے برابر ہے ، اتنے برطانوی پونڈ یا ڈالر کے برابر ہے یا اس رقم میں اتنا آٹا خریدہ جاتا ہے وغیرہ۔ اب جب بھی

وہ واپس ہو، اوپر بتائی ہوئی یا معاہدے کے مطابق طے کی ہوئی قدر کے برابر وہ رقم ادا کی جائے اس طرح شاید قرض دینے والا بھی ہچکچاہٹ کا شکار نہ ہو اور لینے والا بھی کوشش کرے کہ رقم کی واپسی جلد از جلد ہوتا کہ اس کو اضافی رقم ادا نہ کرنی پڑے۔

نظام بینک کاری منافع کی شرح کا تعلین کر لینا سود کی ایک شکل بن جاتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس کا تعین جو بھی کیا جائے وہ پہلے سے تعین شدہ نہ ہو اور ''محدود'' بھی نہ ہو۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ منافع ہمیشہ آدھا آدھا ہوتا ہے، ''فی صدی نہیں'' اور منافع ہوتی ہی وہ رقم کے جو ہر قسم کے اخراجات، مثلات، تنخواہیں، عمارات اور مشینری کی خرید و فروخت اور اس کی مینٹینس، ہر قسم کی ترسیلات وغیرہ کے بعد بچ رہے۔ اس کا کچھ حصہ نہیں، بلکہ وہ ساری بچ رہنے والی رقم میں سب برابر برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اس طرح اگر غور کیا جائے تو اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ صارفین کو ان کی سوچ سے بھی کہیں زیادہ آمدنی ہو جو وہ موجودہ نظام بینک کاری میں حاصل کر رہے ہیں۔

یہ مانا کہ اس دور میں اصلاح کا کام بہت ہی مشکل ہے خواہ وہ فرد کی ہو، معاشرے کی ہو، شہر کی ہو، ملک کی ہو یا اداروں کی لیکن اس کو کیا کہا جا سکتا ہے کہ اصلاح کے بغیر آگے بڑھنے اور بڑھتے رہنے کا عمل بھی ممکن نہیں۔

یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ سود جیسی لعنت اتنی پروان چڑھ چکی ہے کسی کا بچ رہنا کہیں سے کہیں تک ممکن نظر نہیں آ رہا ایک حدیث میں اس بات کی نشاندہی کچھ اس انداز میں کی گئی ہے۔

''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا، یقیناً لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ کوئی نہ بچے گا وہ سود کھانے والا ہوگا۔ جو سود نہ کھتا ہوگا تو اس کا غبار اس کے اندر پہنچے گا (ابن ماجہ)

اور اگر غور کریں تو لگتا ہے کہ جس زمانے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے وہ یہی زمانہ ہے اس لئے کہ عملاً اس زمانے میں یوں لگتا ہے کہ کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں جو سود کی لعنت سے محفوظ ہو۔

سود کتنا بڑا گناہ ہے، اگر اس کا ادراک ہو جائے تو انسان کا بدن اس طرح کپکپانے لگے جیسے سردی کھایا جسم۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ سود خوری کے گناہ کے ستر حصے ہیں، ان میں سے سب سے معمولی ایسا ہے جیسے اپنی ماں کے ساتھ ''منہ کالا کیا جائے'' (ابن ماجہ)

اسی طرح ایک اور جگہ حضرت عبداللہ بن حنظلہ سے روایت ہے کہ فرمایا حضور اکرمؐ نے کہ سود کا ایک درہم جو آدمی کھاتا ہے وہ ایسا ہے کہ اس نے چھتیس بار زنا سے زیادہ گناہ کیا ہو (مسند احمد)

اتنا کچھ جانے کے باوجود نہ معلوم کیوں ہم آپ اور دنیا بھر کے مسلمان سود سے اجتناب کرتے نظر نہیں آتے اور من حیث القوم اس بات کی سعی و جہد کرتے دکھائی نہیں دے رہے کہ سود سے نجات کی راہ تلاش کی جائے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ کچھ علما و مشائخ اس جانب متوجہ ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ان کی کمزور سی سہی، بینکاری کے نظام کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ڈھالنے کی سعی و جہد نظر آنے لگی ہے۔ اللہ کرے کہ پاکستان کے سارے علما و مشائخ اس جانب بھرپور توجہ دیں تا کہ کم از کم پاکستان کے عوام اس لعنت سے بچے رہنے میں کامیاب و کامران ہو سکیں۔ (آمین)

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر آسیہ شبیر
ڈاکٹر سلمیٰ محمود
مس طاہرہ عبدالقدوس
[1]

خواتین کے حلقہ ہائے درسِ قرآن

طُریقِ تدریس، اثرات، مسائل اور تجاویز

پاکستان کے دوسرے بڑے شہر لاہور میں خواتین کے دینی مدارس کی کافی بڑی تعداد موجود ہے، لیکن حلقہ ہائے درس کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ قرآن مجید کے مطالعے کی سرگرمی انفرادی طور پر بھی جاری ہے اور اجتماعی طور پر بھی دینی جماعتوں اور تنظیمات کے تحت یہ سلسلہ جاری ہے۔ انفرادی حلقے عام طور پر مدارس سے فارغ التحصیل (عالمہ وغیرہ) یا مختصر کورس مکمل کر لینے والی خواتین قائم کرتی ہیں۔ عام طور پر ایسے حلقوں کا کسی ادارے یا تنظیم سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ کاوش تو انفرادی ہوتی ہے لیکن مدرّسات اپنے ادارے سے عملی وابستگی برقرار رکھے ہوئے ہوتی ہیں۔ دینی جماعتوں اور تنظیموں کے تحت چلنے والے چند نمایاں حلقہ ہائے درس یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

جماعت اسلامی حلقۂ خواتین

جماعت اسلامی پاکستان، قیام پاکستان سے پہلے کی جماعت ہے لیکن حلقہ خواتین کا دعوتی کام پاکستان کے قیام کے کچھ عرصے بعد منظّم ہونا شروع ہوا۔ مولانا مودودیؒ نے اپنے گھر والوں کے ساتھ، حلقہ خواتین کی بعض ارکان کو بھی قرآن مجید کا کافی حصہ سبقاً سبقاً پڑھایا۔ یہی خواتین بعد ازاں لاہور میں خواتین کے دروسِ قرآن کے حلقوں کی اوّلین مدرّسات بنیں۔ اس اعتبار سے جماعت اسلامی حلقہ خواتین کو بطور تنظیم لاہور شہر میں حلقہ ہائے درس کا بانی قرار دیا جاسکتا ہے۔

جماعت اسلامی کے زیر اہتمام مختلف رہائشی علاقوں میں درس قرآن کے باقاعدہ حلقے قائم کیے گئے ہیں۔ جہاں ہفتہ وار، پندرہ روزہ دروس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ رمضان المبارک میں دورہ قرآن اور دورہ تفسیر قرآن کی کلاسیں کئی مقامات پر منعقد کروائی جاتی ہیں۔ فہم قرآن انسٹیٹیوٹ قائم کیا گیا ہے جس کے زیر اہتمام سالانہ اور کم مدت کے قرآنی کورسز متعارف کروائے گئے ہیں۔ فارغ التحصیل طالبات/خواتین وہیں اساتذہ کی زیر نگرانی فن تدریس بھی سیکھتی ہیں جس کو مزید بہتر بنانے کے لیے معلمات کو کورسز بھی کروائے جاتے ہیں۔ ایسی خواتین اپنے اردگرد اور محلے میں ایسی کلاسوں کے انعقاد کی ذمہ داری سنبھالتی ہیں۔

منہاج القرآن ویمن لیگ

تحریک منہاج القرآن کا ذیلی شعبہ ہے۔ 1988ء میں اس کا آغاز ہوا اور اس کے مقاصد واہداف میں سے ایک اہم نکتہ ''قرآن مجید کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط کرنا اور اس کی تعلیمات کی طرف رجوع کرنے کی دعوت'' دینا ہے۔ تنظیم کا ڈھانچہ یوں ہے: دعوت، تربیت، تنظیمات اور شعبہ امور طلبہ۔ تنظیم کے مقاصد میں ایک اہم مقصد قرآن کی تلاوت اور تشریح کو فروغ دینا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سیمینارز، کانفرنس، ٹریننگ کورس اور ورک شاپس وغیرہ منعقد کروائی جاتی ہیں۔ ادارے کے تحت قرآن کی تبلیغ وتعلیم کے لیے عرفان القرآن کیمپ لگایا گیا، جس میں پاکستان بھر سے معلمات کو حلقہ درس قرآن قائم کرنے کی تربیت دی گئی، جس کے بعد خواتین کے حلقہ دروس قرآن کا ایک وسیع نیٹ ورک قائم ہوا۔ اس کے مقاصد درج ذیل ہیں:

الف۔ قرآن مجید سے قلبی تعلق جوڑنا

ب۔ قرآن مجید کی تعلیم کو عام فہم انداز میں خواتین تک پہنچانا

---

[1] لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور

ج۔قرآنی تعلیمات پر مبنی اسلامی اقدار وافکار کا فروغ

عرفان القرآن کورس میں قرآن مجید کی مکمل تجوید مع عملی مشق، قرآن مجید کا لفظی و بامحاورہ ترجمہ، تفسیر، عربی گرامر، احادیث نبوی اور دعائیں سکھائی جاتی ہیں۔ منتظمین کے دعوے کے مطابق صرف تین ماہ کے عرصے میں خواتین وہ کچھ سیکھ جاتی ہیں جو عام مدارس میں سال ہا سال تک پڑھایا جاتا ہے۔

الہدیٰ اور النور انٹرنیشنل:

یہ دونوں ادارے اہل حدیث مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والی ڈاکٹر فرحت ہاشمی اور ان کی بہن ڈاکٹر نگہت ہاشمی نے قائم کیے ہیں۔ الہدیٰ ایک رجسٹرڈ این جی او ہے جو مختلف مذہبی، فلاحی اور اصلاحی پروگراموں کا انعقاد کرتی ہے۔ یہاں تعلیم القرآن کے نام سے فہم قرآن شارٹ کورس کرائے جاتے ہیں۔ جو عموماً ایک سال کے دورانیے کے ہوتے ہیں۔ تجوید کے چار ماہ پر مشتمل مختصر کورس بھی کروائے جاتے ہیں۔ ان کورسز میں قرآن مجید کی تلاوت اور تجوید، ترجمہ، لفظ بہ لفظ وضاحت اور تفسیر کروائی جاتی ہے نیز علوم القرآن اور عربی گرامر سے بھی روشناس کروایا جاتا ہے۔ کلاس میں قرآن مجید کی تفسیر صرف ڈاکٹر فرحت ہاشمی کے آڈیو ویڈیو کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔ مدرّسات تفسیر کے علاوہ دیگر کلاسیں لیتی ہیں۔ قرآن مجید کے آن لائن کورسز بھی کرائے جاتے ہیں۔

النور انٹرنیشنل ڈاکٹر نگہت ہاشمی نے 1996ء میں قائم کیا۔ لاہور کے علاوہ دیگر کئی شہروں میں ان کے کیمپس ہیں۔ یہ قرآن مجید کی تفہیم کے لیے قائم کیا گیا ادارہ ہے، جس کا مقصد لوگوں کو ان کے گھروں میں تعلیمات قرآنی کی آگاہی دینا ہے۔

زینب اکیڈمی اور حمنہ سنٹرز:

یہ حنفی دیوبندی مسلک سے تعلق رکھنے والے پیر ذوالفقار احمد نقش بندی کی زیر نگرانی خواتین اور بچیوں کی دینی تعلیم کے لیے قائم کیے گئے ادارے ہیں۔ پیر ذوالفقار صاحب کا حلقہ تصوف بھی شہرت رکھتا ہے جس میں وہ باقاعدہ مرد وخواتین سے بیعت لیتے ہیں۔

زینب اکیڈمی اور حمنہ سنٹرز کے زیر اہتمام شہر کے مختلف علاقوں میں طالبات کے لیے دینی مدارس قائم کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان اداروں کے زیر اہتمام کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طالبات، گھریلو خواتین اور ورکنگ ویمن کے لیے مساجد، یونیورسٹیوں، پرائیویٹ اداروں، گھروں اور شہر کے بڑے شادی ہالوں میں لیکچر اور رمضان المبارک میں دورہ قرآن مجید کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے لیے بعض اوقات اکٹھے (پردے کے ساتھ) پروگرام رکھے جاتے ہیں۔ عالمہ طاہرہ یوسف اور عالمہ ماریہ ان اداروں کی روح رواں ہیں۔

طریق تحقیق

اس موضوع پر تحقیق کے لیے لاہور کے لیے حلقہ ہائے درس قرآن کا جائزہ لیا گیا۔ خاص طور پر وہ دروس، جو باقاعدہ کلاس کی طرز پر شروع کیے گئے ہیں۔ خواتین کی فہم قرآن کی کلاسیں کئی طرح کی ہیں۔ ان میں کئی اہم مواقع پر ہونے والے دروس (مثلاً خوشی، غمی، کسی اہم دن مثلاً بارہ ربیع الاول، عشرہ محرم، استقبال رمضان وغیرہ) بھی شامل ہیں۔ جہاں مستقل ہفتہ وار کلاسیں ہیں، وہاں عام طور پر قرآن مجید مسلسل ترجمہ وتفسیر کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔ پندرہ روزہ اور ماہانہ کلاسوں میں قرآنی تعلیمات یا مختلف موضوعات کے تحت دروس کا اہتمام ہوتا ہے۔ دورہء قرآن میں کہیں تو سادہ ترجمہ کے ساتھ مطالعہ ہوتا ہے۔ (ایک ڈیڑھ گھنٹہ) اکثر جگہ ڈھائی سے تین گھنٹوں کی رمضان کی اس بھرپور کلاس میں ایک مہینے کے اندر پورے قرآن مجید کے ترجمے اور اہم مضامین کے اجمالی تعارف سے گزار دینے کا اہتمام ہوتا ہے۔ درس قرآن کی مستقل ہفتہ وار کلاسوں میں عام طور پر وقت کا بڑا حصہ قرآن مجید کے لیے وقف ہوتا ہے کہیں تجوید، گرامر، ترجمہ اور کہیں کہیں کچھ خاص ابواب حدیثِ نبوی کی کسی کتاب سے بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ زیادہ تر کلاسیں (50 فیصد سے زیادہ) دوپہر سے پہلے منعقد ہوتی ہیں کہ اس میں گھریلو خواتین وقت نکال لیتی ہیں۔ میڈیکل ڈاکٹرز کا ایک مستقل حلقہ شام کے وقت ہفتہ وار کلاس کا اہتمام کر لیتا ہے۔ رمضان المبارک میں دورہء قرآن بھی کچھ فجر کے بعد اور زیادہ تر ظہر

سے پہلے رکھے جاتے ہیں کہ ان اوقات میں خواتین سہولت کے ساتھ شرکت کرسکتی ہیں۔

قرآن مجید کی تعلیم وتعلم کے یہ حلقے خواتین پر بے حد مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں۔(اگرچہ بغور مشاہدے اور تجزیے سے بعض مسائل سے بھی آگاہی ہوئی)۔

اس تحقیق کے حوالے سے اہتمام کیا گیا کہ ان شرکائے حلقہ سے سوال نامے کے ذریعے براہ راست معلومات حاصل کی جائیں جو ان حلقہ ہائے درس میں کم از کم ایک سال سے مستقل شرکت کررہی ہیں (100 خواتین)۔

سوال نامے سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں یہ ضرورت بھی محسوس کی گئی کہ ان حلقہ جات کی "مدرّسات" سے بھی کچھ معلومات حاصل کی جائیں کیونکہ "سامعات" یا شرکائے دروس کی بعض مشکلات ومسائل کا تعلق پڑھانے والی خواتین کے فہم دین اور طریق تدریس سے تھا۔ چنانچہ مدرّسات کے لیے بھی ایک سوالنامہ تیار ہوا، جو کم از کم 25 خواتین سے پر کروایا گیا۔

تیسرا اہم ذریعہ ان خواتین سے بالمشافہ ملاقات کا اہتمام تھا جو کم از کم دس سے لے کر تیس سال سے فہم قرآن مجید کی کوششوں میں عملاً مصروف ہیں اور عام طور پر ایک سے زیادہ حلقہ درس کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ کئی مقامات پر براہِ راست شرکت کے ذریعے درس قرآن اور سامعات ومدرسات کے طرز عمل کے مشاہدے اور تجزیے کا اہتمام کیا گیا۔ سروے کے نتائج حاصل کرنے کے لیے SPSS پروگرام کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس جائزے میں جن سامعات سے رائے لی گئی ان میں صرف ناظرہ قرآن مجید کی تعلیم سے لے کر میٹرک، ایف اے، بی اے، ایم اے، ایم بی بی ایس، فارمیسی اور پی ایچ ڈی کی ڈگریوں کی حامل خواتین شامل تھیں۔

درس قرآن میں شرکت کے محرکات

خواتین کے درس قرآن میں شرکت کے محرک کا مطالعہ بھی دلچسپ تھا۔ 36 فیصد خواتین اپنے حلقہء احباب اور پڑوس میں ہونے والی ان کلاسوں میں ایک دوسرے کو شرکت کی دعوت دیتی ہیں، اور چند مرتبہ شرکت کے بعد تقریباً 64 فیصد خواتین کلاس کی مستقل شرکاء میں شامل ہوجاتی ہیں۔ تقریباً دو تہائی کی یہ شرح بڑی حوصلہ افزا ہے۔ ایسے گھروں کی بچیوں اور رشتہ دار خواتین میں بھی ایسی کلاسوں سے تعلق کی شرح 50 فیصد تھی۔ وہ عام طور پر زندگی بھر (مثلاً 20 سال، 25 سال) ان حلقوں سے تعلق قائم رکھتی ہیں۔ یہ خواتین اپنی گھریلو تقریبات اور چھوٹی محفلوں میں باقاعدہ یا بے قاعدہ، درس یا دینی معاملات میں گفتگو کے مواقع بھی پیدا کرتی ہیں اور دینی معلومات میں دوسروں کو شریک کرتی ہیں۔

شرکائے درس پر مثبت اثرات

سوال ناموں میں سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق شرکائے درس خواتین نے مثبت اثرات اور حلقہ قرآن مجید میں شرکت کے ثمرات وبرکات کو واضح کیا ہے۔ 100 فیصد خواتین نے لکھا کہ انھیں دینی معلومات اور عمل، دونوں اعتبار سے بہت فائدہ ہوا ہے۔ 26 فیصد خواتین نے اجمالاً بتایا کہ انھوں نے اپنی زندگی کے بہت سے معاملات میں اپنی دینی معلومات کی روشنی میں اصلاح کی ہے۔ البتہ 74 فیصد نے اس اصلاح کے مختلف مظاہر کا بھی ذکر کیا۔ اس جائزے کے اہم نکات درج ذیل تھے۔

قرآن مجید سے تعلق

قرآن مجید کی تدریس کے یہ حلقے خواتین کے قرآن سے تعلق کو مضبوط بناتے ہیں۔ ترجمہ وتفسیر کے ساتھ پڑھنے سننے سے تقریباً 70 فیصد خواتین نے لکھا کہ ان کا قرآن مجید سے تعلق بڑھا ہے۔ یہ ہر دو طرح سے ہے۔ تلاوت میں بھی اور سمجھنے میں بھی۔ 94 فیصد خواتین نے لکھا کہ تجوید کے مختصر سبق سے ان میں یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ اپنی تلاوت کو بھی درست کریں البتہ یہ دلچسپ بات تھی صرف 25 فیصد خواتین نے لکھا کہ تجوید کو ان کلاسوں کے باقاعدہ نصاب کا حصہ ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ خواتین جس طرح بچپن سے پڑھنے کی عادی ہوچکی ہیں، اس کو سو فیصد درست کرنا آسان نہیں۔ اس کے لیے زیادہ وقت

چاہیے جو ہفتہ وار کلاس میں ممکن نہیں ہو پاتا۔

عبادات

قرآن مجید سے تعلق فرض اور نفل عبادات کے ذوق کو بھی پروان چڑھاتا ہے۔ 65 فیصد خواتین نے بتایا کہ ان کلاسوں میں شرکت کے بعد وہ نماز کی پابند ہوگئی ہیں۔ 91 فیصد خواتین نے زکوٰۃ کا حساب کر کے، پابندی سے ادا کرنے کا شعور بیدار ہونے کی بات کی۔ 61 فیصد خواتین نے بتایا کہ وہ عبادات میں خشوع وخضوع پر توجہ دینے کی کوشش کرتی ہیں رمضان کی دورہ قرآن کی کلاس میں وہ دیگر لوگوں کو بھی شریک کرتی ہیں اور روزے کے احکام ومسائل کی واقفیت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ نوافل (نمازیں، صدقات وغیرہ) کا ذوق بھی بڑھتا ہے، خاص طور پر خصوصی مواقع کے لحاظ سے ہونے والے دروس کے ذریعے۔

اخلاق ومعاملات:

خواتین کی اکثریت نے اپنے جوابات میں یہ اظہار بھی کیا کہ انھوں قرآن پڑھنے کے بعد اخلاق ومعاملات میں اپنی اصلاح پر توجہ کی ہے جس طرف پہلے ان کا خیال نہیں جاتا تھا۔ درگزر، صبر وشکر، قناعت ،توکل ،ہمدردی ،مہربانی اور خاندانی زندگی میں اخلاقی اصلاح کی کوششوں میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اپنی زبان اور ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچانا، اور حسبِ استطاعت دوسروں کی مدد کی کوشش کرنا اور بخل سے پرہیز بعض نمایاں اخلاقیات تھیں جن کا خواتین نے لکھا۔ اسی طرح رشتے داروں سے تعلق کو بہتر بنایا۔

معاملات زندگی میں سب سے زیادہ خواتین نے خوفِ خدا کا احساس، حلال وحرام کی پہچان کا شعور بیدار ہونے کی بات کی۔ 98 فیصد سے زیادہ جائزوں میں حجاب اور ساتر لباس کے رجحان میں اضافے کا تذکرہ بھی آیا اور یہ بھی کہ ان میں بے حیائی کی مختلف صورتوں سے بیزاری پیدا ہوئی ہے۔ اپنے فرائض کی ادائیگی کے احساس میں اضافہ ہوا ہے۔ 84 فیصد خواتین نے اظہار کیا کہ ان کے دنیاداری میں انہماک (لباس، گھریلو سجاوٹ، غیر ضروری شاپنگ، غیر ضروری مصروفیات) میں بہت کمی آئی ہے اور انھوں نے اس مقابلے بازی سے گریز کا شعوری فیصلہ کیا ہے۔ 80 فیصد خواتین نے بتایا کہ ان میں خلافِ شرع کاموں سے اجتناب کا داعیہ پیدا ہوا ہے۔

تربیتِ اولاد اور افرادِ خانہ:

دروس قرآن مجید کے ان حلقوں میں شریک خواتین میں بچوں اور اہل خانہ کی دینی تربیت کا احساس بیدار ہونے کا معاملہ بڑا نمایاں ہے۔ اکثر وہ اس حوالے سے فکرمندی کا اظہار کرتی، سوالات کرتی اور ایک دوسرے سے تجربات کا باہمی تبادلہ کرتی (دوران درس ہی) نظر آتی ہیں۔ مثلاً ایک خاتون نے سوال کیا۔ "مجھے تو قرآن مجید کی سمجھ اب آئی ہے۔ بچے بڑے ہوگئے ہیں غفلت کے ڈھب پر، ان کے لیے کیا کروں"؟ ایک خاتون نے بتایا: "میں نے چھوٹے بچوں پر زیادہ توجہ شروع کی ہے۔ ابھی انھیں آسانی سے ڈھالا جاسکتا ہے، اگرچہ بڑوں کو بھی توجہ دلاتی رہتی ہوں"۔ بچیوں بچوں کے لباس اور دیگر معاملات پر بھی خواتین نے توجہ شروع کی ہے، جس کا پہلے انھیں احساس نہیں تھا۔

اب وہ شوہروں اور گھر کے بڑوں کے لیے بھی حکمت کے ساتھ پابندی نماز روزہ کی تلقین کی کوشش کرتی ہیں اور نیکی کے کاموں میں بچوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔

خدمتِ خلق اور انفاق فی سبیل اللہ:

قرآن وحدیث کی تعلیم کے اثر سے خواتین میں انفاق فی سبیل اللہ اور خدمتِ خلق کا جذبہ بھی فروغ پذیر ہوا ہے۔ اس حوالے سے خواتین کی تنظیمات کا کردار زیادہ نمایاں ہے۔ عام خواتین صرف غریب رشتہ داروں اور قریب کے لوگوں کا خیال رکھ پاتی ہیں لیکن دینی جماعتوں کے ملک گیر نظام کے باعث ان کی فلاحی سرگرمیوں اور ہنگامی حالات میں امداد (سیلاب، زلزلے وغیرہ) کے لیے باقاعدہ ادارے موجود ہوتے ہیں۔ دروس قرآن کے خواتین کے حلقوں کو ان تنظیمات کے ذریعے اپنی امداد دور دراز کے علاقوں تک پہنچانے کا موقع مل جاتا ہے۔ مثلاً ایک خاتون اپنی مدرسہ سے تھر میں پانی کا کنواں کھدوانے کا خرچ معلوم کر رہی تھیں۔ ایک اور موقع پر درس میں موجود خاتون نے بتایا کہ انھوں نے اپنا گھر فلاں دینی فلاحی

تنظیم کو وقف کر دیا ہے۔

مثبت معاشرتی میل جول:

دروسِ قرآن مجید کے ان حلقوں کے ذریعے خواتین کے مثبت معاشرتی میل جول میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ خواتین، جو عام طور پر گھر داری کی مصروفیات میں سے محلے داروں کی خبر گیری کا وقت نہیں نکال پاتیں، یہ محفل ان کے لیے خوش گوار ماحول میں میل ملاقات کا موقع پیدا کرتی ہے (بالکل ایسے ہی جیسے ایک محلے کے مردوں کی نماز باجماعت)۔ بڑی عمر کی وہ خواتین جو بعض اوقات گھروں میں بے اعتنائی کا شکار ہوتی ہیں، ان کی تنہائی دور کرنے اور مثبت نفسیاتی رویوں کے حصول کے لیے بھی یہ کلاسیں اہم ہیں۔ کلاسوں میں اکثر عملی رہنمائی بھی کی جاتی ہے، چنانچہ یہ خواتین عبادات، اذکار اور دیگر مثبت سرگرمیوں میں اچھی خاصی مصروف ہو جاتی ہیں۔ خوشی غمی کے مواقع میں بھی یہ معاشرتی تعلقات سہارے کا باعث بنتے ہیں۔ مسائلِ حیات سے آنے والے ذہنی دباؤ (tension) کا مقابلہ کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے، کہ باہمی تعلق کے ساتھ ساتھ ذکر الٰہی کی یہ محفلیں سکونِ قلب کا باعث بنتی ہیں۔

مسائل اور مشکلات

دروسِ قرآن مجید کے انفرادی اور اجتماعی حلقوں کی کاوشوں کے خواتین پر بلاشبہ بہت سے مثبت اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ لیکن تفصیلی سروے اور مشاہدے سے بعض جگہ کچھ مسائل سامنے آئے، جن میں سے بعض اہم مسائل کا تذکرہ ذیل میں کیا جا رہا ہے۔

مسلکی اثرات:

سب سے بڑا مسئلہ جو دونوں سوالناموں (مدرّسات سے اور شرکائے درس) انٹرویوز، مشاہدات اور ملاقاتوں سے سامنے آیا، مسلکی رواداری کے حوالے سے تھا۔

مدرّسات سے ایک سوال یہ کیا گیا تھا کہ کیا آپ کے حلقہ درس میں صرف ایک ہی مسلک کی خواتین شرکت کرتی ہیں یا ہر مسلک کی۔ سو فیصد جواب یہ تھا کہ ہر مسلک سے تعلق رکھنے والی شرکاء درس ہر درس قرآن میں موجود ہوتی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ خواتین کی مجبوری بھی ہے کہ وہ اپنے قریب ترین مقام پر درس میں شامل ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں مدرّسات کے طرزِ عمل میں وسعت اور رواداری نہ ہو تو دلوں میں تنگی پیدا ہونا اور مسلکی رجحانات میں اضافہ ایک فطری عمل ہے۔ دوسری طرف شرکائے درس سے سروے میں حیرت انگیز بات سامنے آئی کہ 40 فیصد خواتین کسی خاص مسلک یا تنظیم کے حلقہ درس میں شرکت کرتی ہیں اور اسے اپنے مسلکی نقطہ نظر سے ہی ترجیح دیتی ہیں۔ باقی 60 فیصد خواتین ہر حلقے اور ہر تنظیم کے درس میں شریک ہو جاتی ہیں۔

مشاہدات سے جو مسلکی سوالات دیکھنے کو ملے، وہ کوئی بڑے مسائل نہیں تھے۔ نکاح وطلاق کے عملی مسائل میں عام طور پر لوگ علماء اور مفتی حضرات سے رہنمائی لیتے ہیں۔ خواتین کے حلقوں میں طریقہ نماز، وتر پڑھنے کا طریقہ، تراویح کی تعداد اعتکاف کے بعض چھوٹے اور فروعی مسائل وغیرہ عام طور پر دیکھنے کو ملے (یہ سوالات تو کالج میں اسلامیات لازمی پڑھنے والی ایف اے اور بی اے کی طالبات بھی اٹھانے لگی ہیں جس پر ایک مرتبہ کلاس بدمزگی کا شکار ہوگئی) اہل علم جانتے ہیں فقہائے اربعہ کے ہاں اس حوالے سے کتنی وسعت موجود رہی ہے، کہ دوسرے کے ہاں نماز ادا کرتے ہوئے وہ انھیں امام بنا کر ان کے طریقے پر نماز ادا کر لیتے تھے۔

مدرّسات سے اس سوال کے جواب میں، کہ آپ کا مسلک کیا ہے اور آپ کس مسلک کو درست سمجھتی ہیں اور کیا آپ کے خیال میں کسی دوسرے مسلک کے مطابق عمل کی گنجائش بھی ہے؟ یہ رائے 70 فیصد تک دیکھنے کو ملی کہ ان کا مسلک فلاں ہے اور وہی درست ہے۔ 50 فیصد نے یہ بھی لکھا کہ اس کے علاوہ کوئی طریقہ درست نہیں ہے۔ رائے شماری کا یہ جائزہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ مسلکی ترویج بھی بہت سے مقامات پر پیش نظر رہتی ہے۔ بعض اوقات ایسے سوالات استاذہ کی مرضی سے اٹھائے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک دورہ قرآن مجید میں، جبکہ رمضان نصف سے زائد گزر چکا تھا، مستقل مدرسہ کے ساتھ ایک مہمان استاذہ تشریف لائیں جو کسی مدرسے سے تازہ فارغ التحصیل ہوئی تھیں۔ قرآن مجید کی دو سورتیں

انھوں نے تفسیر کے ساتھ پڑھائیں، دوران تفسیر بھی ایک دو شاذ آراء پر اصرار کیا۔ درس ختم ہونے کے بعد ان کے ساتھ تشریف لانے والی ایک اور خاتون نے سیاق وسباق سے ہٹ کر، دوسرے مسلک کے لیے مذمتی پیرائے میں، تراویح کا سوال اٹھا دیا۔ اس طویل سوال کے دوران ہی خواتین کی طبیعت مکدر نظر آنے لگی اور دو گھنٹوں سے جاری خوشگوار محفل بدمزگی کا شکار ہوگئی۔ آدھی سے زیادہ خواتین جواب سنے بغیر اٹھ کر روانہ ہوگئیں۔ کئی ایک نے جاتے جاتے فرقہ واریت کی مذمت میں تبصرے بھی کیے۔

تفاہم کی فضا کا متاثر ہونا اور حقیقی مقاصد سے دوری:

مسلکی نقطہ نظر کو ابھار کر بیان کرنے سے بعض اوقات تفاہم کی فضا متاثر اور مکدر ہوتی ہے اور وہ لوگ، جن میں مسلکی شعور زیادہ واضح نہیں تھا، وہ بھی "اپنے" حلقوں کو تلاش کرنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 40 فیصد خواتین کی رائے تھی کہ وہ صرف اپنے ہی مسلک کا درس سنتی ہیں، کوئی اور نہیں۔ کسی ایک فقہی نقطہ نظر کا قائل ہونا بالکل بجا ہے۔ جمہور علمائے امت اس کے قائل ہیں، لیکن پورے حق کو کسی ایک ہی مسلک میں منحصر سمجھ لینے، اپنے ہی طریقے پر مسلسل اصرار اور دوسرے طریقے کی بہانے بہانے سے مستقل تنقیص وتردید سے فضا تنگ ہونے لگتی ہے۔ دروس قرآن کے سارے حقیقی مقاصد اور مثبت اثرات (مثلاً قرآن سے تعلق، عبادات کا ذوق، خدمتِ خلق، باہمی تعلقات کی خوشگواری وغیرہ) زائل ہونے لگتے ہیں اور شرکاء محفل میں بھی "مسلکی برادری" کا احساس حاوی ہونے لگتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے بھی ایک سے زیادہ طریقے روایت کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے بقول چونکہ اللہ تعالیٰ کو مطلوب یہ تھا کہ اس کے نبی کے سارے طریقے محفوظ رہیں، چنانچہ مختلف لوگوں نے مختلف طریقوں کو اختیار کرلیا۔(۱) یہ احساس اگر مدرسات میں پیدا ہوجائے تو نچلی سطح پر ضرور منتقل ہوسکتا ہے۔

محدود مطالعہ، محدودیتِ فکر:

خواتین اپنی ہمہ جہتی مصروفیات میں مطالعے کا بہت موقع فراہم نہیں کر پاتیں، چنانچہ دورہ قرآن مجید ہو یا ہفتہ اور پندرہ روزہ قرآن کلاس، مدرّسات عام طور پر محدود مطالعے کے ساتھ تدریس کرتی ہیں۔ صرف 15 سے 20 فیصد خواتین نے بتایا کہ وہ ایک سے زیادہ تفسیر سے تیاری کرتی ہیں، ورنہ 80 فیصد تک خواتین نے نصاب میں ایک تفسیر مقرر کر رکھی ہے۔ اکثر شرکائے درس بھی وہی لے لیتی ہیں۔ اس کا نقصان یہ ہے کہ بعض اوقات ایک تفسیر میں کوئی نکتہ اجمالاً بیان ہوتا ہے، دوسری میں وہ تفصیل سے آجاتا ہے۔ یوں ایک تفسیر کی تیاری سے شرکائے درس اس علم سے محروم رہ جاتے ہیں جو ان کی مدرسہ کی ذرا زیادہ تیاری سے انھیں آسانی سے حاصل ہوسکتا تھا۔

آج ویسے ہی مذہبی معلم کی معلومات زیادہ وسیع ہونے کی ضرورت ہے۔ زندگی کے مسائل میں جو تنوع ہے، اور اس نے مذہب کے لیے بالعموم جو چیلنج پیدا کیا ہے، اس کا جواب وسعتِ مطالعہ ومشاہدہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس کی مثال ایک حلقہ درس میں تب دیکھنے کو ملی جب ایک خاتون نے خواتین کی زیبائش کے کسی معاملے میں سوال کیا۔ مدرسہ نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر بے تکلف جواب دیا "حرام" ہے۔ حالانکہ وہ معاملہ مباحات میں سے تھا اور زیادہ مبنی بر احتیاط رائے دی جاتی تو مکروہ تنزیہی کہلا سکتا تھا۔

طرز تدریس

ہمارے دروسِ قرآن مجید میں طرزِ تدریس اکثر بیانیہ اور خطابی ہے۔ دروس قرآن کی شرکاء میں اگرچہ پڑھی لکھی خواتین بھی ہوتی ہیں لیکن اکثر بڑی عمر کی خواتین کم تعلیم یافتہ ہیں۔ یوں ایک ملے جلے حلقے میں تدریس کو عام فہم ہونا چاہیے اور مجلس کی ذہنی سطح اور ان کے معاملات زندگی سے متعلق رہنمائی پر مشتمل، لیکن شان نزول کی بحثیں، قرآن اول کے قصے، اور ان کے حوالے سے جذباتی تقاریر بعض اوقات سننے والوں کے اس خیال کو راسخ (جی ہاں، خیال تو پہلے ہی موجود ہے) کرتی ہیں کہ قرآن مجید کسی اور زمانے کی کتاب ہے۔ مثلاً انّما المؤمنون اِخوۃ کی تفسیر اگر پیش کی جائے کہ مؤاخاتِ مدینہ کی مثال چشم فلک نے نہیں دیکھی۔ تو اس میں عش عش کرنے کا بلاشبہ بہت سامان ہے، لیکن اسی آیت کی تفسیر

اگر اس حدیث مبارکہ سے ہو کہ مومن مومن کا بھائی ہے، اس پر ظلم نہیں کرتا، ظلم سہنے کے لیے اسے تنہا نہیں چھوڑتا، تو اس میں عملی نکات موجود ہیں مسلمانوں کے باہمی معاملات میں رہنمائی کے حوالے سے۔(2)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات سیرت وحدیث کی کتب میں موجود ہیں۔مختصر، واضح، مدلل، برمحل، برجستہ اور سادہ مثالوں سے مزین، کبھی آپ نے سوال اٹھائے، مجمع سے جواب لیا اور اس سے ایک نتیجہ اخذ کر کے انھیں عمل کی راہیں سمجھائیں۔کبھی سوال اٹھایا، اور خود ہی جواب دے دیا۔(3)

طریق تدریس میں وہاں ایک تنوع ہے جو بیزاری، اونگھ اور جمائی پیدا کرنے کا باعث نہیں بنتا۔جدید طرز تدریس بھی اس بارے میں بہت رہنمائی کرسکتا ہے۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ ہماری مدرّسات اپنی "جادو بیانی" یا جذباتی اپیل" کے ذریعے ہی سامعات کو متاثر کرنے کی زیادہ کوشش کرتی نظر آتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اکثر سامعات نے اپنی تجاویز میں لکھا کہ "مدرّسات کو چاہیے کہ وہ لوگوں کے فہم کے مطابق درس دیا کریں۔"

دین آسان ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا تھا کہ جب دو معاملے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیے جاتے تو آپ ان میں سے آسان کو اختیار فرماتے تھے۔دور حاضر کے ایک بڑے فقیہ لکھتے ہیں کہ کسی سائل کے جواب میں "احوط اور ایسر" میں سے انتخاب کرنا ہو تو احوط یعنی زیادہ مبنی بر احتیاط فتویٰ کی بجائے ایسر یعنی زیادہ آسان معاملہ تجویز کرنا چاہیے۔(4)

ہماری معاشرتی زندگی کچھ اس طرح چل رہی ہے کہ دین سے محبت کے باوجود زندگی کے معاملات کا بہت سا حصہ ایسا ہے۔جس کے بارے میں عام لوگوں کو معلومات تک نہیں، عمل تو بعد کی بات ہے۔ ضروری ہے کہ یہ معلومات سہولت، آسانی اور تدریج کے ساتھ ان تک پہنچائی جائیں۔ورنہ عام لوگ اس سے بدکنے لگتے ہیں۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کی ایک اور حدیث ہے کہ اگر شروع میں ہی یہ احکام آجاتے کہ شراب نہ پیو اور بدکاری نہ کرو تو لوگ عمل نہ کر پاتے۔لیکن پہلے آخری پاروں کی آیات اتریں جن میں توحید اور آخرت کا بیان تھا۔ اور بعد میں دیگر احکام۔(5)

ہماری مدرّسات اکثر اس آسانی اور تدریج کے اصول کا خیال نہیں رکھ پاتیں جس کی شکایت شرکائے درس نے کی کہ " کچھ چیزیں سمجھ آتی ہیں اور کچھ نہیں"۔مثلاً ایک مدرسہ نے استیذان کے آداب یوں بتائے گویا گھر کے ہر کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر اہل خانہ ایک دوسرے سے بات کرسکیں گے۔ یوں پوری محفل پریشان تھی کہ دن بھر یہ ہفت خوان" کون طے کیا کرے گا؟ حقیقت میں اس محفل میں خواتین استیذان کا فلسفہ سمجھ سکیں نہ احکام۔

یہی معاملہ اکثر اوقات پردہ، زکوٰۃ، احکام طہارت کے بیان میں دیکھا گیا۔حتیٰ کہ تلاوتِ قرآن اور تعلق بالقرآن کے حوالے سے مدرّسہ نے تجویز کیا کہ رمضان میں دن میں فجر کے بعد، اشراق کے بعد، قرآن کلاس میں گیارہ سے ایک بجے کے دوران پھر ظہر کے بعد، پھر عصر کے بعد اور پھر افطار سے پہلے اور بعد تلاوت کرنی چاہیے۔وہ خواتین جن کی بیسوں ذمہ داریاں ہیں، دم بخود تھیں کہ نیک دل اور مبارک معمولات میں مصروف مدرّسہ ان کے لیے کیا نسخہ تجویز کر رہی ہیں۔!

تفسیر قرآن کے لیے کیسٹ اور سی ڈی کا استعمال:

ٹیکنالوجی بلاشبہ ایک نعمت ہے اور اپنے فارغ وقت میں اس سے استفادہ خواتین کے لیے سہولت کا باعث ہے۔وہ گھر کے معمولی کاموں کے ساتھ تلاوت، ترجمہ، تفسیر اور درسِ قرآن سے استفادہ کرسکتی ہیں۔ لیکن ملک گیر تنظیمات کے بعض اجتماعی پروگراموں میں بھی صرف کیسٹ سی ڈی سے تدریس کا طریقہ اختیار کیا جانے لگا ہے۔بتایا گیا کہ تفسیر صرف سی ڈی سے ہوگی، باقی چھوٹے موٹے پروگرام براہ راست ہوتے ہیں۔عمومی تدریس کے علاوہ دورہ قرآن مجید (رمضان) میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جہاں شرکائے کلاس کو پورا پارہ مع تفسیر آڈیو سننا ہوتا ہے۔

مشاہدہ یہ ہے کہ اس طریقے میں چونکہ مدرّسات اور سامعات کا

براہ راست تعلق قائم نہیں ہو پاتا اور عین موقع پر ذہن میں اٹھنے والے کسی سوال کا جواب حاصل کرنے کا موقع نہیں ملتا، چنانچہ تفہیم اور توجہ، دونوں میں کمی رہ جاتی ہے۔ واضح رہے کہ سوالناموں کے جائزوں سے ظاہر ہوا تھا کہ 91 فیصد دروس قرآن میں خواتین خاموش سامع نہیں ہوتیں، وہ اپنا سوال مؤخر بھی نہیں کرتیں بلکہ فورا سوال یا تبصرہ (comment) کر کے اس کی تشفی چاہتی ہیں۔ یہ تشفی اس طریق تدریس میں ہو نہیں پاتی۔

ڈاکٹر گوہر مشتاق (پی ایچ ڈی کیمسٹری) امریکہ میں مقیم ایک دردمند مسلمان ہیں، جو مختلف معاشرتی موضوعات پر سائنس اور اسلام کی روشنی میں کالم لکھتے رہتے ہیں۔ انھوں نے علمِ دین کے حصول کے لیے "صرف" مشینی طریقہ استعمال کرنے پر نقد کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ " مشینی تدریس استاد اور شاگرد کے براہ راست تعلق میں رکاوٹ ڈالتی ہے اور دونوں کی قوتِ تخیل اور قوتِ تخلیق کو کم کرتی ہے۔" انھوں نے اس کے لیے ہارورڈ یونیورسٹی میں ہونے والی ایک مثال بھی دی جس کے لیے بچوں کے دو گروپ بنائے گئے۔ ایک نے براہ راست استاد سے تعلیم حاصل کی اور دوسرے گروہ کو آڈیو اور ویڈیو کے ذریعے تعلیم دی گئی نتیجہ یہ تھا کہ استاد سے سیکھنے والے بچوں میں حقائق کی روشنی میں نتائج نکالنے اور نئے خیالات تخلیق کرنے کی صلاحیت" کئی گنا" زیادہ تھی۔(6) ہارورڈ میں ہونے والی یہ تحقیق دنیاوی تعلیم کے لیے تھی، دینی علوم کا معاملہ تو زیادہ نزاکت رکھتا ہے اور زیادہ احتیاطوں کا تقاضا کرتا ہے۔

دینی احکام میں سے کسی ایک پہلو پر اصرار:

خواتین کے دروس قرآن کے حوالے سے ایک شکایت عام ہے اور بہت پرانی بھی۔ افراد میں یا تنظیمات میں بھی بعض اوقات دین کے کسی خاص معاملے پر اتنا زور دیا جاتا ہے گویا وہ ہی اصل دین ہے۔ یہ معاملات عقائد کے بھی ہو سکتے ہیں اور عبادات و معاملات میں بھی۔ مثلاً لاہور کے حلقہ ہائے درس میں گزشتہ چند سالوں سے دیکھنے میں آ رہا ہے کہ اگر کسی تنظیم کے تحت آٹھ یا دس جگہ درس کے حلقے قائم ہیں تو ان کی دعا ایک ہی جگہ رکھی جاتی ہے۔ دورہ قرآن کی دعا کے دن احکام حجاب خاص طور پر بیان کرنے کے لیے سورہ نور اور سورہ احزاب پر درس رکھ لیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس دن کے لیے معمول سے کئی گنا زیادہ لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔

حجاب کوئی کم اہم معاملہ نہیں ہے۔ لیکن قرآن مجید کی ترتیب توقیفی ہے۔ آیاتِ حجاب بھی اسی ترتیب میں دیکھی جانی چاہئیں، اگر پورے قرآن مجید کا مطالعہ جاری ہے تو نماز، عبادات، ایمانیات اور حلال وحرام کے شعور کے بعد ساتر لباس اور حجاب کا تقاضا خواتین خود سمجھ لیتی ہیں۔ خصوصی دعوت پر دعا میں شریک ہونے والی وہ خواتین، جنھوں نے پورا قرآن مجید بھی نہیں سنا، اکثر اس ترتیب سے مضطرب نظر آتی ہیں۔ یہ ایک مثال صرف یہ واضح کرنے کے لئے دی گئی ہے کہ تدریج دینی حکمت کا تقاضا ہے اور دین کے کلی فہم کو مدِ نظر رکھنا زیادہ اہم ہے بہ نسبت کسی حکم کو قرآنی ترتیب سے ہٹ کر بیان کرنے کے۔

فہم قرآن کلاسوں کی بہتری کے لیے تجاویز

شہر لاہور کے جائزے سے جو صورت حال سامنے آئی ہے وہ صرف اسی شہر کی نہیں، تقریباً یہی معاملات ملک بھر کی قرآن کلاسوں میں جاری ہیں بعض قرآنی حلقات ایسے بھی ہیں جو ملک گیر تنظیمات نے قائم کیے ہیں۔ یہ حلقات دیگر شہروں میں بھی قائم ہیں۔ اسی طرح انفرادی کاوشیں بھی ہر جگہ جاری ہیں۔ مسائل و مشکلات اور سوالناموں میں شرکاءِ درس کی تجاویز کی روشنی میں چند نمایاں عملی نکات مختصراً تجویز کیے جا رہے ہیں۔

دین کا کلی فہم:

مدرّسات اور تنظیمات پوری کوشش کریں کہ ان کے حلقہ درس میں دین کا کلی فہم دینے کی کوشش کی جائے۔ قرآن مجید کے معیشت، معاشرت، سیاست، بین الاقوامی تعلقات اور تمدنی ضوابط کے سارے احکام بیک وقت مطلوب ہیں۔ ہم خود سے ان کی درجہ بندی کرنے کے مجاز نہیں چنانچہ خواتین میں انفرادی، اجتماعی، ملکی اور بین الاقوامی سطح کی (بطور امت) ذمہ داریوں کا احساس بیدار کرنے کی کوشش کی جائے۔ عالمی سطح پر مسلمان جن مسائل میں مبتلا ہیں، ان کے اثرات سے کوئی بھی

محفوظ نہیں۔ دین کا کلی فہم ہی اس صورتِ حال میں ہمیں اعتماد اور سر اٹھا کر جینے کا حوصلہ عطا کرسکتا ہے۔

مسلکی گنجائشوں میں وسعت اور رواداری:

دینی حلقوں پر الزامات کی فہرست میں سب سے پہلا الزام عدم برداشت اور رواداری کی کمی کا ہے۔ یہ الزام غلط بھی نہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہماری مدرّسات کو شاید علم نہیں کہ اس وقت امت کی عالمی سطح کی علمی قیادت "تلفیق" کے اصول پر بڑے بڑے معاملوں میں فیصلے دے رہی ہے۔ (مثلاً مجمع الفقہ الاسلامی، جدہ)(7) خواتین مدرّسات اگر اس اہم اسلامی اصول کو مد نظر رکھیں تو ان کے حلقا تمسلمانوں کو فروعی مسائل سے نکال کر ایک امت بنانے میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔ ان کی سامع خواتین رواداری کا یہ جذبہ اپنے پورے گھر کو منتقل کریں گی۔ چنانچہ مدرّسات کی "مہمات" میں مسلکی تفریق ابھارنا نہیں، بلکہ اس حوالے سے خوشگواری اور برداشت کا احساس ارزاں کرنا لازم ہے۔

اہلِ علم اور اہلِ دین کی پذیرائی:

رواداری اور وسعت خیال پیدا کرنے کا ایک بڑا کامیاب طریقہ لاہور کے چند فورمز forums پر دیکھا گیا کہ مسلکی تفریق کے بغیر گاہے بگاہے اہلِ علم خواتین وحضرات کو دعوت دی جاتی ہے۔ کسی بڑے پروگرام کی افتتاحی اور اختتامی تقریب میں بطور صدر مجلس یا بطور مہمان مقرر اپنے حلقے سے باہر کے دیگر اہل علم کو مدعو کرنے سے فاصلے کم ہوتے ہیں اور استفادے کے مواقع وسیع تر ہوجاتے ہیں۔

قرآن مجید کے متن سے جڑے رہنا:

قرآن مجید کے متن سے حلقہ قرآن کو جوڑے رکھنا بہت اہم ہے۔ اکثر شرکائے درس خواتین نے مدرّسات کے لیے تجویز کیا کہ وہ to the point بات کیا کریں۔ خاص طور پر جہاں تعلیم قرآن کا معاملہ ہو، یہ اصول اور بھی اہمیت رکھتا ہے۔ برِصغیر میں شاہ ولی اللہ نے اسی طرز تفسیر پر زور دیا ہے، اور وجہ یہ بتائی ہے کہ طویل تفسیریں الفاظ قرآن کا مدعا گم کردیتی ہیں۔"(8)

متن کے قریب رہنے کے حوالے سے شاہ عبدالقادر نے اپنے ترجمہ قرآن "موضح القرآن" کے دیباچے میں بڑے سادہ مگر قطعی اور پر اثر الفاظ میں لکھا ہے کہ بتانے والے بہتیرا بتائیں، جیسا خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں آپ بتایا ہے، ویسا کوئی نہیں بتا سکتا اور جیسا اثر اور راہ پانا خدا کے کلام میں ہے، کسی اور کے کلام میں نہیں۔(9)

یہ نکتہ اس حوالے سے بھی اہم ترین ہے کہ صرف اسی پر عمل کرلیا جائے تو اوپر بیان کردہ بہت سے مسائل پیدا ہی نہیں ہوں گے۔

حلقہ درس اور عملی زندگی:

ضروری ہے کہ سامعات کی ذہنی سطح پیش نظر رکھ کر انھیں دین کی بات سمجھائی جائے۔ ان کی روزمرہ زندگی سے مثالیں دی جائیں اور دین کی تطبیق اور اطلاق کے لیے عملی رہنمائی دی جائے۔ اس کتاب ہدایت پر عمل کو قرنِ اول کی داستانوں کی صورت میں ہی نہ سنایا جائے، بلکہ واضح کیا جائے کہ یہ ہم سب کی زندگی کا لائحہ عمل ہے۔ لاہور کے مکتبوں پر عالم عرب کی مشہور مصنفہ مدرسہ اور داعیہ دین سمیہ رمضان کی کتاب "قرآن پر عمل" عام دستیاب ہے جس میں انھوں نے اپنے حلقہ درس کی ایسی مثالیں اکٹھی کی ہیں کہ قرآن مجید سننے کے بعد خواتین نے کس طرح اسے اپنی عملی زندگی کا حصہ بنایا۔

اصولِ تفسیر کی واقفیت:

یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مدرّسات کے اندر قرآن مجید کے بنیادی علوم مثلاً اصول تفسیر، ناسخ ومنسوخ، شان نزول اور اس کی اہمیت، قرآنی احکام کے عموم وخصوص کی بنیادی واقفیت پیدا کی جائے۔ منسوخ آیات قرآن مجید میں بہت کم ہیں، لیکن اس کے باوجود کئی کئی سال سے تدریس سے وابستہ خواتین بھی ان معاملات میں غلطیاں کرتی نظر آتی ہیں۔

تدریج:

تدریج، احکام دین کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس کی بہت خوبصورت مثال دی ہے کہ مکی زندگی میں توحید، آخرت اور عذاب وثواب کے تصورات پہلے

ذہن میں بٹھادیئے گئے، پھر بعد میں احکام حلال وحرام نازل ہوئے۔بلاشبہ اخلاص اور دل سوزی، دینی اوردعوتی جوش کے ساتھ جذباتی تحریک کے ذریعے دینی احکام خاص طور پر اصولِ معاشرت وغیرہ پرعمل کے لیے لوگوں کوفوری آمادہ کیا جاسکتا ہے۔لیکن تدریج کی حکمت کوملحوظ رکھے بغیرعمل میں یکلخت تبدیلی کے تقاضے کے لیے شدت کا رویہ اختیار کرلینا مناسب نہیں۔ جوخواتین اس طرح کی جذباتی تبدیلیاں اختیار کرتی ہیں،عام طور پر وہ دیر پا ثابت نہیں ہوتیں۔اس کے مقابلے میں عقل واستدلال کے زور پراورافرادخانہ کوکسی درجے میں قائل کرکے اخلاق ومعاملات کی تبدیلیاں زیادہ پائیداراوردوسروں کے حق میں بھی زیادہ اثر کرنے والی ہوتی ہیں۔

معاشرتی احکام ویسے بھی دین کا وہ حصہ ہیں جہاں ایمانیات اور عبادات کے برعکس وسیع گنجائش اورحالات وظروف اورعرف وعادت کا لحاظ رکھنے کے مواقع شریعت میں بڑی فراخی کے ساتھ مہیا کیے گئے ہیں۔ضروری ہے کہ اہل علم خواتین، عام خواتین کو دینی تعلیم مہیا کرتے ہوئے شرعی سہولتوں اورآسانیوں کوپیش نظر رکھیں۔اہم اوراہم تر مقاصد سامنے رکھیں تاکہ تدریس قرآن کے اہتمام سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کیے جاسکیں۔

حوالہ جات:

(1)۔خطبات بہاول پور،ڈاکٹر حمیداللہ، 45،بیکن بکس، لاہور،2005

(2)۔جامع ترمذی۔ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ،باب ماجاء فی الستر علی المسلم،حدیث،1426

دارالسلام للنشر والتوزیع،ریاض، 9991ء 21۔انسان کامل،ڈاکٹر خالدعلوی،216،الفیصل ناشران کتب،اردوبازار، لاہور ،2005ء

(3۔صحیح بخاری،محمد بن اسمٰعیل،کتاب الادب،حدیث،6126، دارالسلام للنشر والتوزیع،ریاض،1999ء

(4)۔دین میں ترجیحات،یوسف القرضاوی، 123،ادارہ منشورات،منصورہ،ملتان روڈ،لاہور،2008ء

(5)۔صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن،حدیث 4993، دارالسلام للنشر والتوزیع،ریاض،1999ء

(6)۔معرکہ روح وبدن،ڈاکٹر گوہرمشتاق،33،ادارہ بتول،لاہور، 2005ء

(7)۔محاضرات فقہ،ڈاکٹرمحمود احمد غازی،533،الفیصل ناشران کتب،اردوبازار

(8)۔الفوز الکبیر، 45،قرآن محل،مولوی مسافر خانہ،کراچی، 1989ء

(9)۔مقدمہ موضح القرآن،1،تاج کمپنی،لاہور،س۔ن

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

قرآن اور مسلمان

مرے دوستو تم سنو میری بات
میں کہتا ہوں تم سے یہ رازِ حیات

محمدؐ کی امت کا کیا حال ہے
نہیں ہے ڈھکی اور چھپی کوئی بات

نہیں کوئی دنیا میں پرسانِ حال
کہیں فرقہ بندی کہیں ذات پات

بھلایا سبق دیں کا چھوڑا جہاد
چاکری غیر کی ان کا طرزِ حیات

''مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے''
ہیں ان کے دلوں میں بسے سومنات

اگر کامیابی کی ہے کچھ طلب
اگر چاہتے ہو جہاں میں ثبات

جوانو سنو یہ ہے کرنے کا کام
تم اپنے دلوں میں بٹھا لو یہ بات

ہے قرآں میں انساں کے دل کا سرور
یہی ہے مسلماں کا طرزِ حیات

گر اس کو بناؤ گے اپنا عمل
مسخر تمہارے لئے شش جہات

بنا اس کے کچھ بھی نہیں پاؤ گے
ادھوری رہے گی تمہاری حیات

یہی راز ہے اب سمجھ لو اسے
یہی ہے مسلماں کی کل کائنات

معظم معین

نعت

ہم اس کا نقشِ پا بھولے ہوئے ہیں
خدا وندا! یہ کیا بھولے ہوئے ہیں

چلو پھر لوٹ جائیں اس طرف کو
جدھر کا راستہ بھولے ہوئے ہیں

اسے دیکھیں تو یاد آتا ہے ہم کو
کہ ہم رسم وفا بھولے ہوئے ہیں

سر ساحل ضرور اتریں گے اک دن
پرندے راستہ بھولے ہوئے ہیں

گھرے ہیں تنگناؤں میں کچھ ایسے
سمندر کی ہوا بھولے ہوئے ہیں

قسم ہم کو عطاؔ شریں لبوں کی
بیاں کا ذائقہ بھولے ہوئے ہیں

عطاالحق قاسمی

غزل

منزلوں سے فاصلہ اچھا لگا
گھر سے گھر کا راستہ اچھا لگا

چپکے چپکے بولنا اچھا لگا
کان میں رس گھولنا اچھا لگا

ہلکی پھلکی دشمنی کے درمیاں
دوستی کا سلسلہ اچھا لگا

اس کا زہریلی ہنسی کے باوجود
مسکرا کر دیکھنا اچھا لگا

موسموں کی دھوپ چھاؤں کی طرح
مان جانا روٹھنا اچھا لگا

اس کا یوں بے التفانہ پن کے ساتھ
بے رخی سے دیکھنا اچھا لگا

روشنی کے خط پہ خط کھنچتے رہے
شب کو تارے توڑنا اچھا لگا

جانے کیوں شب بھر مجھے اے آسماں
چاند تارے نوچنا اچھا لگا

زندگی کی تلخیوں کے جام میں
بچپنے کا گھولنا اچھا لگا

اس بتِ کافر کا یوں پہروں مجھے
دل ہی دل میں کوسنا اچھا لگا

دل بہت رویا مگر پھر بھی حبیبؔ
اس کا ظالم قہقہہ اچھا لگا

حبیب الرحمٰن

عجب یہ خوش گمانی ہے

عجب یہ شادمانی ہے
عجب یہ خوش گمانی ہے
ادھر والے کنارے سے
اُدھر والا کنارہ
خوب تر ہوگا
نہایت پر فضا ہوگا
نہایت خوش نما ہوگا
مگر اس خوش گمانی کو
مٹانے پر تُلا ہے دل
میں اسکو کیسے سمجھاؤں
کہ ہیں سب ایک سے ساحل
سوا اچھا ہے کہ ناؤ اور چپو
اس کنارے پر ہی رہنے دوں
اداسی اور ویرانی کی لہروں کو
ادھر والے کنارے پر ہی
بہنے دوں
اُدھر والے کنارے کو
ابھی آباد رہنے دوں
دلِ ناشاد کو اپنے
گماں سے شاد رہنے دوں

نجمہ یاسمین یوسف

دعاوطن کے لئے

میرے وطن کے مقدر کی کب سحر ہوگی
ہمارے حال پہ مالک کی کب نظر ہو گی
مہیب اندھیروں میں کب تک یونہی بسر ہوگی
دکھائے روشنی وہ کون سی ڈگر ہوگی

بہاریں روٹھ گئیں ہر طرف اُداسی ہے
زمین دیس کی اپنے لہو کی پیاسی ہے

مرے کسان زمینوں میں ہل چلاتے ہوئے
زمیں کی کوکھ سے لعل و گہر اُگاتے ہوئے
زمین کے سینے پہ اپنا لہوبہاتے ہوئے
اُنہیں کا پھل ہیں یہ سب کھیت لہلہاتے ہوئے

مگر وہ پھر بھی اندھیروں میں ہی بھٹکتے ہیں
سیہ نصیب کے در پہ جبیں پٹکتے ہیں

جو چاہو تم تو سنبھلنے کا وقت ہے اب بھی
کہ راستوں کو بدلنے کا وقت ہے اب بھی
حسین سانچوں میں ڈھلنے کا وقت ہے اب بھی
مصیبتوں سے نکلنے کا وقت ہے اب بھی

نئی اُمنگوں نئے حوصلوں کو اپناؤ
کہ ابر بن کے ہر اک خشک و تر پہ چھا جاؤ

خدایا ہم کو دکھا دے نئی سحر کا نور
ہمیں عطا ہو نئی عظمتوں کا ذوق و شعور
ہم اپنے سر کو جھکائے ہوئے ہیں تیرے حضور
معاف کردے ہماری خطائیں اور قصور

قبول شبنم عاجز کی یہ دعائیں کر
کبھی نہ رات ہو جس کی ہمیں ملے وہ سحر

شبنم طارق

ام ایمان

مسافر لوٹ آئے

برف باری اچانک شروع ہوئی۔ آسمان سے سفید پھول برسنے لگے ہلکے پھلکے لیکن تسلسل سے برستے یہ پھول ہر طرف سفید چادر بچھاتے چلے جا رہے تھے۔ سردی زیادہ نہ تھی لیکن ہمت خان جانتا تھا کہ جلد ہی یہ سردی بہت زیادہ ہو جائے گی۔ اُسے اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ مہاجر کیمپ سے نکلے دس دن ہو گئے تھے۔ ان دس دنوں میں اس نے ایک لمبا سفر طے کیا تھا۔ فاصلہ زیادہ تھا لیکن اسقدر بھی نہیں کہ دس دن لگ جاتے۔ پہلے کبھی یہ سفر چار دن کا بھی نہیں ہوتا تھا۔

اتنا وقت سفر میں لگنے کا سبب جگہ جگہ فوجی چوکیاں تھیں۔ اگرچہ حکومت کی طرف سے افغانستان واپس آنے والوں کو خوش آمدید کہا جا رہا تھا لیکن عملی طور پر معاملہ الٹا تھا۔ آنے والوں کی ایک طرح سے حوصلہ شکنی ہی کی جا رہی تھی۔ اول دستاویزات کی پڑتال کے بہانے چوکیوں پر کافی دیر روک لیا جاتا، پھر کچھ دے دلا کر معاملہ طے کرنا پڑتا، پھر یہ بھی صاف صاف جتا دیا جاتا کہ حالات اب بھی ٹھیک نہیں، آپ اپنے گاؤں جانا چاہتے ہیں تو اپنی ذمہ داری پر جائیں۔

یہ باتیں ہمت خان کے لئے نئی نہیں تھیں۔ کیمپ میں رہتے لوگ ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔ ہمت خان کبھی ایسی باتوں پر کان نہیں دھرتا تھا۔ اس کو یقین تھا ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ جب وہ اپنے گاؤں جائے گا۔ ہمیشہ وہاں رہنے کے لئے!

بس اُس سامنے والے پہاڑ کو عبور کرتے ہی ہم اپنے گاؤں کو دیکھ سکیں گے۔

ہمت خان نے اپنے بیٹے شمروز خان سے کہا۔ شمروز نے سر ہلایا۔ اس کے ماتھے پر پریشانی کی لکیریں تھیں۔ لیکن وہ اپنے بابا کے لئے اپنے چہرے پر بشاشت لانا چاہتا تھا۔

پیچھے زوار خان عورتوں اور بچوں کے ساتھ تھا۔ خچروں پر سامان لادا تھا۔ برف کی چادر بچھتے ہی سب کے قدموں کے نشان اس پر واضح ہونے لگے لیکن کچھ ہی دیر میں مزید پڑنے والی برف انہیں ڈھانک لیتی۔

چوٹی تک پہنچتے پہنچتے موسم پھر بدلا۔ اب برف کے پھولوں کی برسات رک گئی تھی اور سورج کی سنہری کرنیں برف پر پڑنے کے بعد روپہلی سی نظر آ رہی تھیں۔

اونچائی سے دور تک نظر آ رہا تھا۔ ہمت خان نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سب طرف نظر ڈالی۔ ایک سا منظر تھا۔ کہیں کسی گاؤں کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہاں البتہ ایک طرف ٹوٹی ہوئی دیواروں اور چھتوں کا ملبہ سا تھا۔ ورنہ سب طرف تباہی اور ویرانی تھی۔ گہرے گڑھے جو بموں کے گرنے کے باعث بنے تھے۔ کہیں تباہ ہوئی فوجی گاڑیوں کے ٹکڑے، جلے ہوئے درخت..... سبزے کا ایک احساس سا تھا کہیں کہیں سبز رنگ کی صورت میں ..... کچھ درخت بھی تھے جو اپنی سخت جانی کے باعث بچ گئے تھے۔

ہمت خان کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اس کا گاؤں اس کی زمین اس کا گھر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کا برسوں کا خواب پورا

ہونے میں دیر کتنی تھی۔بس پہاڑ کی ڈھلان عبور کرتے ہی وہ اپنے گاؤں میں ہوں گے۔

اتنا سا فاصلہ تو وہ بچپن میں قلانچیں بھرتے طے کرلیا کرتا تھا۔یہ فاصلہ بھی بھلا کوئی فاصلہ ہے.....بس کچھ دیر ہوگئی، وہ ہوگا اور اس کا گاؤں.....اس کا گھر جہاں وہ پچاس سال تک رہا تھا.....اپنی شرینہ کے ساتھ.....بیاہ کر آئی تھی تو ایسی جیسے انار کی کلی.....سارے گاؤں میں دھوم تھی۔ہمت خان کی بیوی کو دیکھنے کے لئے گاؤں کی ہر عورت آئی تھی۔صبح سے شام تک عورتوں اور لڑکیوں سے گھر بھرا رہا تھا۔لڈوؤں کے تھال کے تھال ختم ہو رہے تھے مہمانوں کی خاطر داری کے لئے۔

بے ساختہ مسکراہٹ ہمت خان کے چہرے پر آئی تو شہروز حیران سا ہوگیا۔گاؤں کی تباہی کو دیکھ کر بابا مسکرا رہے ہیں۔لیکن اسے کیا پتہ کہ اس کے باپ کی آنکھیں کیا دیکھ رہی تھیں۔

ثمر خان، ہادی خان پھر لالہ جان.....معصوم پھول اس کے گلشن کے حسین اور نوخیز.....جو شہروز اور شمروز کے بعد پیدا ہوئے تھے، گھر کی رونق تھے۔ان کی شرارتوں پر شرینہ انہیں ڈانٹتی تو ہمت خان منع کرتا۔

یارا! یہ میرے گھر کی رونق ہیں۔دیکھ شہروز اور شمروز بڑے ہوگئے ہیں۔یہ ابھی معصوم نہیں۔ان کو کھیلنے دو۔

مرغی کے چوزوں کے پیچھے بھاگتے ثمر ہادی اور لالہ پورے صحن میں دوڑتے پھرتے، شرینہ انہیں باہر باغیچے میں بھیج دیتی۔

''جاؤ باہر جاؤ اور جب تک صحن کی صفائی نہ ہو اندر نہ آنا۔''

ہمت خان کی آنکھوں کے سامنے اس دن کا منظر گھوم گیا جب شرینہ انہیں باہر بھیج رہی تھی۔لیکن لالہ نے گُڑ کے لڈو کی ضد کی۔شرینہ کے پیچھے پیچھے تینوں کمرے میں داخل ہوگئے۔لڈو جو لینے تھے۔ہمت خان نے گھر کے دروازے کے اندر جانے کے لئے قدم بڑھایا ہی تھا کہ زور کا دھماکہ ہوا۔بم عین گھر کی چھت پر گرا تھا۔دھول مٹی کا ایک غبار تھا۔جس نے ہر چیز کو چھپا لیا تھا۔ہمت خان لپکا۔

میرے بچے.....میرے معصوم پھول.....میری بیوی شرینہ.....

چھوٹے سے گاؤں کی ہر گلی کا یہ ہی عالم تھا۔کتنے گھر تباہ ہوئے کتنوں کے گھر والے بچوں سمیت چھتوں کے نیچے دفن ہوگئے۔لوگ جان بچا کر بھاگ رہے تھے۔

فوج گاؤں میں داخل ہونے والی ہے۔جو زندہ بچ گئے ہیں ان کی زندگی بچاؤ.....کوئی زور سے چیختا ہوا گزرا۔

ہمت خان کو بڑے بیٹوں شمروز اور شہروز کا دھیان آیا کہ پھر دھماکہ ہوا اور پھر ایک اور دھماکہ..... بمباری تسلسل سے ہونے لگی۔ہمت خان بھاگا۔گاؤں سے باہر کی طرف.....گلی عبور کرتے ہی اسے شمروز اور شہروز نظر آ گئے۔

لیکن پھر دوبارہ گاؤں میں داخل ہونا نصیب نہیں ہوا۔وہ بیٹوں کے ساتھ پاکستان ہجرت کر گیا۔مہاجر کیمپ میں اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ سالوں گزار دیئے یہیں ان دونوں کی شادیاں کر دیں۔

بہویں اس کے چچازاد بھائی کی بیٹیاں تھیں زرگل جو گاؤں سے زخمی حالت میں صرف دو بیٹیوں کو بچا کر لا سکا تھا۔اس کی ایک ٹانگ کاٹنی پڑی تھی۔اس کے لئے دو بچیوں کے ساتھ معذوری کی زندگی ایک عذاب تھی۔

کیمپ میں ہمت خان جب اُس سے ملنے گیا تو اس کا دکھ جان گیا۔اس نے ہاجرہ اور زرینہ کو اپنے بیٹوں کے لئے مانگ لیا۔اس کو وہ خوشی یاد آ گئی جو اس نے زرگل کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ہاجرہ اور زرینہ دونوں اچھی بہوئیں تھیں۔ہمت خان کا باپ کی طرح خیال رکھتی تھیں۔بیٹیوں کی شادی کے دو ماہ بعد ہی زرگل کا انتقال ہوگیا تھا۔اُن کے لئے تو بس اب ہمت خان ہی باپ تھا۔

ہمت خان نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔عورتیں اور بھی تھیں جو واپس گاؤں جانا چاہتی تھیں۔ان کے بچے اور ہمت خان کے پوتے پوتیاں، مل جل کر ایک چھوٹا سا قافلہ تھا۔

ہمت خان مسکرایا۔بس اب گاؤں دوبارہ بس جائے گا۔

گاؤں کے گھر، ان سے اٹھتی دھوئیں کی لکیر.....کھیتوں کے سبز جا بجا ٹکڑے.....پھل دار درخت.....لکڑی کی جالیوں پر چڑھی انگور کی

بل کھاتی بیلیں.....تصور کی آنکھ نہ جانے کیا کیا کچھ دیکھ رہی تھی۔

شمروز اور شہروز باپ کے مسکراتے چہرے کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ وہ کہاں دیکھ سکتے تھے جو ہمت خان دیکھ رہا تھا، لہٰذا متعجب تھے لیکن با ادب خاموش کھڑے تھے باپ کے حکم کے انتظار میں.....ہم سورج ڈھلنے سے قبل اپنے گاؤں کو چھولیں گے۔ ہمت خان کی چال میں انوکھی توانائی بھر گئی تھی۔

اوخاناں.....کہاں جاتے ہو؟

پانچ افغان طالبان نہ جانے کس جانب سے آئے تھے۔ رائفلیں تھامے.....بھاری ہتھیار یوں اٹھائے تھے جیسے کھلونے ہوں۔

ہمت خان نے انہیں پلٹ کر غور سے دیکھا

ہم اپنے گاؤں جارہے ہیں۔

کون سے گاؤں؟

وہ سامنے.....وہاں.....وہ دیکھو۔

سپاہی جو آگے تھا طنزیہ مسکرایا۔

اویارا! وہاں اب کوئی گاؤں نہیں.....بس تباہی ہے.....تباہی۔

یہ دیکھو.....اُن پانچوں نے ایک ایک بڑا پتھر ڈھلان پر لڑھکا دیا۔ پانچ پتھروں کے جواب میں تین دھماکے ہوئے۔ یہ بارودی سرنگیں تھیں۔ جو غاصب فوجیوں نے جاتے ہوئے بچھائیں تھیں۔ دیکھو ابھی سورج نہیں ڈھلا واپس نکل جاؤ۔ گاؤں کو جب بسنا ہوگا بس جائے گا ابھی تم اپنے لوگوں کی جانوں کو خطرے میں نہ ڈالو۔

ہمت خان کا ہنستا مسکراتا چہرہ بجھ گیا تھا۔ امید اور خوشی کی چمک غائب ہوگئی تھی۔ آنکھوں کو نظر آتا خوش کن منظر تحلیل ہوگیا تھا۔

پھر واپس وہی کیمپ کی زندگی.....یہ میدان، کوہستان، وادی اور پہاڑ.....کیسی وسعت ہے.....کتنی فراخی ہے۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ وطن کی فضا کیسی معطر ہے۔ پھر واپسی.....؟؟

ہمت خان نے رات یہاں گزارنے پر بیٹوں کو آمادہ کرلیا۔ وہ اپنے باپ کی خواہش کو حکم سمجھ کر وہیں کسی مناسب جگہ کو دیکھنے لگے تاکہ خیمے گاڑ سکیں۔ ہوا میں بے حد ٹھنڈک تھی۔ رات میں برف بھی گر سکتی تھی۔ ان کے پاس خیمے کمبل اور راشن موجود تھا۔

عورتوں نے کھانے کی تیاری کی اور مردوں نے خیمے لگا دیئے۔

رات ہوتے ہوتے سردی کی شدت بہت بڑھ گئی تھی سب کمبلوں میں گھس گئے تھے۔

ہمت خان کو نیند نہیں آرہی تھی کروٹیں بدلتے ہوئے آخر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ خیمے سے نکل کر دیکھا چاند پورا نکلا ہوا تھا۔ روپہلی روشنی میں ہر چیز نہائی ہوئی تھی۔

گھنٹے آدھ گھنٹے کا فاصلہ ہے گاؤں کا.....کیا پھر دوبارہ اس سے دور بہت دور چلا جاؤں گا، سب سو رہے ہیں، میں ان کے جاگنے تک واپس بھی آجاؤں گا.....زندگی رہی تو بچ کر.....ایک عزم کے ساتھ اس نے اپنا مضبوط عصا اٹھایا اور بے آواز نیچے کی طرف چلتا گیا۔

اس کے کان کسی دھماکے کے منتظر تھے۔ ہر آہٹ پر وہ چونکتا..... آہستہ کبھی تیز پوری احتیاط سے چلتا گیا ہونٹوں پر تسبیح کا ورد کرتا وہ ہر جانب غور سے دیکھ رہا تھا۔ چاندنی کی روشنی میں وہ گاؤں تک پہنچ گیا جلدی جلدی اب اس کے قدم تیز اٹھ رہے تھے۔

گھر کے گرے ہوئے در و دیوار کے قریب آکر وہ ٹھٹھک گیا۔ وہ کونے والا کمرہ تھا۔ شرینہ اور بچے اب تک یہاں بے کفن پڑے ہیں۔ اس کو شدید احساس نے کاٹ ڈالا۔

اس کے ہاتھوں میں نہ جانے کیسے طاقت آگئی پتھروں کو ہٹایا چھت کے شہتیر کھسکائے .....لیکن چاند کی روشنی میں اتنا نظر نہیں آرہا تھا۔ چلو صبح کا انتظار کرلیتا ہوں۔

آہٹ پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دونوں بیٹے اس کے پیچھے نیچے آگئے تھے۔ برف پر اس کے قدموں اور عصا کے نشانات کو دیکھتے دیکھتے.....

ہمت خان نے بیٹوں کو دیکھا اور ایک اطمینان کا سانس لیا۔

کچھ دیر میں پو پھٹ گئی۔ تینوں نے تیمّم کر کے باپ کی امامت میں فجر کی نماز ادا کی۔

ہمت خان نے اشارہ کیا۔ تینوں نے مل کر شہتیر ہٹائے۔ کچھ بڑی اور چھوٹی انسانی ہڈیاں نظر آنے لگیں۔ ہمت خان نے اپنی چادر بچھا کر

انہیں سمیٹ لیا اجڑے ہوئے باغیچے میں ایک گڑھا شہروز نے دیکھ لیا تھا ۔کسی بم کے نتیجے میں ہی ہوا ہوگا۔

چادر میں لپٹی ہڈیوں کو ہمت خان نے بڑے احتیاط سے بڑے پیار سے گڑھے میں اتار دیا۔

دونوں بیٹوں نے مٹی ڈالنی شروع کی تو ہمت خان بھی آگے بڑھا۔مٹی کو ہاتھوں سے یوں تھپتھپانے لگا گویا رخصتی کے لیئے دلا سا دے رہا ہو۔

دیکھو! اب نہ گھبرانا ہم پھر آئیں گے ۔تمہارے آس پاس رہیں گے ۔گاؤں کو آباد کریں گے۔

ہمت خان نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے ۔دونوں بیٹوں نے بھی اس کے ساتھ فاتحہ پڑھی اور واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے۔

بہت احتیاط سے نشانات پر چلتے واپس آئے تو خیمے میں عورتیں اٹھ گئی تھیں روٹی خوشبو پھیلی تھی ۔سبز قہوہ اور گڑ کے ٹکڑے.....مزیدار ناشتہ تیار تھا۔

ہمت خان گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر قہوے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ ساتھ یہی سوچ رہا تھا، گاؤں نہ سہی گاؤں کے قریب تو بسا جا سکتا ہے۔یہ اپنی زمین ہے۔میری نسل اپنی زمین اپنے پہاڑوں پر پروان چڑھے..... پھر جب بارودی سرنگیں صاف کر لی جائیں تو ہم اپنے گاؤں چلے جائیں۔ وہ مسکرایا ہمت خان کا چہرہ مستقبل کے حسین خوابوں کی روشنی سے چمکنے لگا۔ مسکراہٹ اس کے چہرے کی ہر سلوٹ ہر جھری میں جگہ بنانے لگی۔

شہروز کی آنکھ سردی سے کھلی تھی ۔آگ کا وہ چھوٹا سا الاؤ جو رات کو سلگایا تھا بجھ چکا تھا۔

اس نے اٹھ کر باپ کے اوپر کمبل ٹھیک کیا۔

بابا کوئی بہت اچھا خواب دیکھ رہے ہیں۔

شہروز نے باپ کے چہرے پر خوبصورت مسکراہٹ دیکھ کر سوچا۔ اچھی طرح کمبل اڑھاتے ہوئے اس نے پیار سے باپ کا ہاتھ اندر کیا۔

انتہائی سرد ہاتھ تھا۔

اُس نے گھبرا کر باپ کو پکارا..... بابا..... بابا!! لیکن اس کی پکار کے جواب میں خاموشی تھی ،مکمل خاموشی ۔نہ جسم میں کوئی حرکت تھی نہ آنکھوں میں۔

شہروز نے گھبرا کر بھائی کو آواز دی ۔اس کے بابا رات کے نہ جانے کس لمحے رخصت ہو کر گاؤں کی جانب اتر گئے تھے..... ہمیشہ کے لئے..... یہ تو خالی جسم تھا.....گاؤں کی جانب چہرہ کیسے ادھ کھلی آنکھوں سے وہ کوئی بہت ہی پیارا خواب دیکھ رہے تھے، جب ہی تو اتنی پیاری مسکراہٹ چہرے پر منجمد ہوگئی تھی! ☆

نصرت یوسف

کہاں آ کے رکنے تھے راستے!

''چھوٹا ذہن یا محدود ذہنیت انسانوں پر گفتگو کرتی ہے، اوسط درجہ کی ذہنیت واقعات پر بات چیت کرتی ہے اور تخلیقی ذہن نت نئے تصورات پر اڑان بھرتا ہے۔''

سندیلہ انعم کے ذہن میں یہ فلسفہ ہمیشہ ہی زندہ رہتا۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو تخلیقی ہی رکھنا چاہتی، محدودیت اور عمومیت کے درجہ پر آ بھی جاتی لیکن جلد ہی اس کی اندرونی مزاحمت اسے بہتر سطح پر دھکیل دیتی۔

وہ اسی ہنر کی بدولت دو بچوں کی ذمہ داری بطور سنگل پیرنٹ بہتر انداز میں نبھا رہی تھی۔ جوانی کا موسم کچھ ہی سال میں ڈھلنے والا تھا، بالکل اسی طرح جیسے دنیا کی ہر شے فنا کی طرف محوِ سفر ہے، دھیرے یا تیز بہر حال خاتمے کا عمل ہر ''موجود'' کے ساتھ موجود ہے سوائے 'خالق کل شئ' کے۔

وہ محض اکیس سال کی تھی جب عاصم محمود نے اسے پہلی طلاق دی۔ اسکو سندیلہ کا اپنی بات سے اختلاف کرنا پسند نہ تھا اور سندیلہ کو محض عاصم کے کہنے پر روشن دن کو رات کہنے کی عادت نہ تھی اگر چہ وہ بات بڑھانے کے بجائے خاموش رہنا پسند کرتی تھی لیکن ''ایمان'' لانے والی کیفیت اس کے لئے ممکن نہ تھی۔ عاصم محمود کو خاموشی بھی کھل جاتی، اس کو ایک، آمنا وصدقنا، کہنے والی بیوی چاہیے تھی جو سندیلہ بہر حال نہ تھی۔ وہ اگر چہ ایسی ہوتی تو عاصم محمود ایک بہتر نوازشات کرنے والا مرد ہوتا جو اپنی فضول سی انا کی تسکین ایک ''صم بکم'' قسم کی عورت سے پا کر اس کو مالا مال کرتے ہیں، ان سے سندیلہ جیسی عورت کو برداشت کرنا ممکن نہیں ہوتا جو سوچوں میں ہوا کے دوش پر اڑان بھرتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ذائقہ تھا، گفتگو میں دلائل اور سوچ میں تنوع، لباس میں وقار اور پیشکش میں جمال۔

خوبیاں عاصم میں بھی تھیں لیکن اس کی خوبیوں کا کوئی جوڑ سندیلہ کے ساتھ نہ تھا۔ دو مختلف، بلکہ انتہائی مختلف ذائقے ایک پلیٹ میں جمع ہو کر عجیب ہو گئے تھے۔ عاصم محمود کی سب سے پہلی طاقتور خوبی جو ہر ایک کو متاثر کرتی وہ 'خوشحال مرد' کی تھی۔ بلاشبہ زندگی کی اہم ضرورت میں سے ایک تھی۔ دوسری خرچ کرنے میں فراخدلی تھی۔ مگر کس پر؟؟ یہ اس وقت پتہ چلا جب وہ اپنے کُلّی حقوق اسکے نام کر چکی تھی۔ تابعداروں کے لئے وہ کرم فرما تھا۔ لباس اس کی پسند کا، خوراک اس کی پسند کی، آرائش اس کی پسند کی، فکر اس کی منشا کی۔ بس پھر وہ حاتم طائی تھا۔

سندیلہ کا مطلب ہی خوشبو اور واقعی خوشبو کی شوقین۔ گھر میں دھیمی لیونڈر اسپرے کی خوشبو عاصم محمود کو جیسے زچ کر دیتی۔

''یہ کیا اگربتی کی سی بو سے گھر کی فضا کو ستیاناس کرتی ہو! اپنا ذوق بہتر بناؤ میڈم!''

ماتھے پر ڈھیروں شکنیں بھرے اس نے گھر کی ساری کھڑکیاں دروازے زوردار آواز کے ساتھ کھول دیئے۔ نومبر کے خنک خوشگوار جھونکوں کے ساتھ گھر کے کھلے حصے میں لگے درختوں میں سے ایک درخت موسم کے سفید پھولوں سے لدا ہوا تھا، اس کی تیز خوشبو سندیلہ کے سر میں ہمیشہ ہی بھاری پن پیدا کرتی تھی، تمام کھڑکیاں کھلتے ہی وہ

پورے گھر میں جذب ہو جاتی۔ سندیلہ نے پھر خوشبو کا شوق ہی نہ کیا۔

''عاصم محمود کے ساتھ رہ کر یہ گھاس پھونس کھانا چھوڑو اور عمدہ کھانوں کا ذوق بناؤ۔''

کانٹے میں آلو پروتی بیوی کو اس نے ابرو اچکا کر دیکھا جو سوئے کے ساگ کے ساتھ لپٹے آلو کے قتلوں کو بڑی رغبت سے کھا رہی تھی۔ اشتہا انگیز ہری مرچ قیمہ اور فش اینڈ چپس کی ٹرے بلاشبہ اس نے خود بڑی محنت سے تیار کی تھی، لیکن آلو کے چپس سویا ساگ میں لپٹے اسے بے حد مرغوب تھے۔

یہ اعتراض شادی کے پہلے ماہ ہی سامنے آ گئے تھے۔ عاصم محمود کے گھرانے میں اول دن ہی سے شادی شدہ بیٹے بہو کا رہائشی پورشن جدا ہوتا تھا۔ سو ولیمہ کی صبح سے سندیلہ کو کچن کی بریفنگ دے دی گئی تھی۔

''مددگار یہاں تمہیں ہر لحہ مل جائیں گے، لیکن میرے لئے کھانا تم نے خود ہی پکانا ہوگا، تم کو عادت ہی ہوگی ویسے۔''

عاصم محمود نے جملہ تلخ نہ کہا تھا لیکن لہجے میں حاکمیت اور جتانے والا رنگ سندیلہ نے فوراً ہی محسوس کر لیا تھا۔ بات کے اثرات اس نے دل تک نہ جانے دیئے اور چہرہ کو بے تاثر ہی رکھنا چاہا، گو اسے ایسی مشق نہ تھی لیکن شادی بھی تو پہلی ہی مشق تھی۔ اسی کے یہ سارے لوازمات تھے۔ تقریبات کی جھلملاہٹیں اور رنگینیاں تو شادی شدہ زندگی کی کتاب کے پہلے کیا آخری باب کی آخری سطر میں بھی جگہ پانے کی وقعت نہیں رکھتیں، یہ جتنی اعلیٰ پایہ کی ذمہ داری اور فرائض میں داخلے کی دنیا ہے، اس کی تقریب میں اتنا ہی وقار اور شائستگی کا اظہار ہونے کے بجائے ایک طلسم سا پیدا کر دیا جاتا ہے۔

سندیلہ کے لئے بھی یہ سحر ٹوٹتا جا رہا تھا۔ ایک خواب کی سی کیفیت.....ایک قدردانی کا نشہ.....الفتوں کا خمار بتدریج دھوئیں کے مرغولوں کی مانند غائب ہوتا جا رہا تھا۔

''نہ جانے سنڈریلا اور شہزادوں کی زندگی شادی کی دعوتوں کے بعد کیسی ہوگی؟''

وہ فالسئی شیڈ ڈیپور شیفون کے سوٹ کے ساتھ سلور گرے پینسل ہیل سینڈل پہنے ہوئے سوچنے لگی۔ اس کے اوسط قد کو ہیل خوبصورت بے شک بناتی تھی لیکن گھنٹوں پہننے سے اس کی ٹانگوں اور کمر کی دکھن بھی صرف اسے ہی برداشت کرنی ہوتی تھی۔ اس لئے سندیلہ نے کبھی ایسے شوق نہیں پالے جو ضرر رساں ہوں۔

''لیکن اب!!!'' اس نے آئینہ میں کھڑے ہوئے اپنے عکس پر ایک گہری سانس لیتے نظر ڈالی۔

''بیگم عاصم محمود تم پر یہ لباس بہت جچ رہا ہے'' آئینہ نے تصدیق کر دی تو وہ مطمئن ہو کر سامنے سے ہٹ گئی۔

عاصم محمود نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا اور دونوں شادی کی تقریب میں روانہ ہونے کے لئے اوپری منزل سے نیچے آ گئے۔ یہاں اس کی جٹھانی اور ساس سسر رہتے تھے۔ خاندان کے رواج ہی کے حساب سے بے جٹھانی کے رہائشی حصہ کا ساس سسر کے حصے سے کوئی انتظامی تعلق نہ تھا۔ سوا نکے ہاں وہ روایتی شکوے اور شکایتیں خاصی حد تک نہ تھے جو عمومی طور پر راج پاٹ کے شوقین بزرگوں کی آل اولاد کے درمیان پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسے ساس سسر کی عنایتیں، کرم فرمایاں ایک دوسرے کو جانبدارانہ لگنے لگتی ہیں۔ ہر ایک اولاد اپنے آپ کو زم زم سے دھلا سمجھ کر دوسرے کو خود غرض سمجھتی ہے اور وہ الفتیں جو بہن بھائیوں کے درمیان کبھی مثالی ہوتی تھیں وہ شکووں کا لاوا بن کر کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی بہہ نکلتا ہے۔ عاصم کے گھر میں ایسے خاموش شکوے تو نہ تھے لیکن وہ اپنی بھابی سے سندیلہ کا مقابلہ ضرور کرتا رہتا تھا۔ اس بہو سے جس کی جڑیں خاندان میں اترے بارہ برس بیت چکے تھے۔ جو ایک کامیاب سوشل ورکر تھی اور مواقع جیتنے کا ہنر بھی رکھتی تھی۔

عاصم محمود سندیلہ سے پندرہ برس بڑا تھا۔ یہ اس کی دوسری شادی تھی۔ اس کا پہلا نکاح جس لڑکی سے ہوا تھا، اس کی رخصتی کچھ مہینوں بعد طے پائی تھی۔ مگر اس سے پہلے ہی وہ دوسرے شہر جاتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گئی۔ طیارے کے حادثے میں اس کا پورا خاندان یکا یک ختم ہو گیا اور عاصم محمود کی شادی بھی۔ اس کے جذبات بھی خاصے متاثر ہوئے بالآخر پانچ سال کے وقفے کے بعد اس کا سندیلہ سے جوڑ بنا۔ گویا

قدرت کے نظام نے سندیلہ کو ہی اس کی منکوحہ اور شریک حیات بنانا تھا ورنہ بیس سالہ سندیلہ کا پینتیس سالہ مرد سے جوڑ کوئی مناسب نہ لگتا تھا۔ وہ چھوئی موئی سی پودے کی طرح نازک اور لچکیلی تھی، لیکن اس کے والد کا خیال تھا کہ بڑی عمر کے مرد کم سن بیویوں کے ناز نخرے اٹھانے میں طاق ہوتے ہیں۔ اس لیے سندیلہ عاصم محمود کے گھر پر راج کرے گی۔ لیکن سندیلہ کے والد کو یہ نہیں پتہ تھا کہ ان کی اکلوتی اولاد کا نصیب اور انکے ارادوں اور توقعات میں کہیں مماثلت نہیں پائی جاتی، وہ واقعی راج کرتی اگر اسے عورت بننے کا ہنر بھی آتا۔ وہ خاموش تو رہ سکتی تھی لیکن 'ایمان' نہ لا سکتی تھی، جبکہ بادشاہ کی حقیقی ملکہ بننے کے لئے اس کی خوابگاہ تک جانا اتنا اہم نہیں ہوتا جتنا اسکے دل تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔ باوجود اپنی سی کوشش کے وہ اپنی ماں کے قالب میں نہ ڈھل پا رہی تھی جس نے سندیلہ کے والد کو ان کی سخت مزاجی کے باوجود بہت ٹھنڈے مزاج سے ساری عمر سہا۔ بے انتہا دوست پرور اور دعوتوں کے شوقین سندیلہ کے والد کو بیوی دن میں طعام اور رات میں قیام کے انتظامات کرتی ہی بھاتی تھی۔ دن بھر میں انکا ہنر بہترین کراکری میں بہترین انداز سے پیش کئے کھانوں میں نظر آنا چاہئے اور رات میں انکا وجود مہکتا اور تروتازہ ہونا چاہئے۔

''مجھے لگتا ہے کسی دن بریانی کو ہی دم دیتے ہوئے میرا دم نکلے گا۔''

ایک روز سندیلہ نے ماں کی کچن میں خود کلامی سنی تو اس نے دل سے اپنی زندگی کا ساتھی اپنے باپ جیسا نہ ہونے کی دعا کی۔ یہ تقریباً ہر روز کی کہانی تھی۔ تین سے چار اہتمام والے کھانے اس گھر میں پکتے، کسی بھی وقت اور کتنی بھی مقدار میں سندیلہ کے والد اپنے ساتھ مہمان لے آتے، جنکی مہمان نوازی میں سندیلہ کی والدہ کو ہر صورت سرگرم دیکھنا انکو مرغوب تھا۔ اس دوران انکے پاس سے نہ لہسن کی بو آئے اور نہ پیاز کی باس۔

''تم میں اور ماسی میں کیا فرق رہ جائے گا پھر!''

اتنی مصروف عورت کے ساتھ میاں کی یہ فرمائشیں بھی سندیلہ نے اپنی والدہ کو پوری کرتی دیکھیں۔ لیکن پھر ایک دن وہ اتنا تھک گئیں کہ شیا ٹیکا کا مرض ساتھی بن گیا۔ بس سندیلہ کے والد نے انہی دونوں عاصم محمود کے لئے سندیلہ کا رشتہ قبول کرلیا۔ جو خیال کبھی بیوی کے لئے نہ نمو پائے وہ بیٹی کے مستقبل کے لئے دن رات انہیں بے چین کرتے اور پھر ایک ''خیال رکھنے والی عمر'' کا انسان انہوں نے چمپئی سی سندیلہ کے لئے پسند کرلیا۔

سندیلہ کے دل میں نہ کوئی ساز بجا نہ گیت ابھرا، اس نے ہمیشہ سوچا تھا کہ اس کی شادی جس سے ہوگی اس کی آنکھیں رضا احسان کی طرح ہنستی ہوں گی، اس کی پھوپھی کا بیٹا، جو بس تین برس ہی اس سے بڑا تھا۔ عاصم محمود کی تصویر پر رضامندی سے قبل پہلی اور آخری نظر ڈالتے ہوئے اس نے بے اختیار رضا کی ہنستی آنکھوں کا سوچا، ''کیا اچھا ہوتا پھوپھی ہی مجھے پسند کرلیتیں۔''

پھوپھو نے اسے پسند تو بیشک نہ کیا اپنے گھر لانے کے لئے لیکن اچھے نصیب کی دعائیں اس کا ماتھا چوم کر ڈھیروں ڈھیر دیں اور پھر وہ یوں سندیلہ محمود بن گئی۔

''یا اللہ یا تو مجھے برداشت کی قوت دے یا پھر عاصم کی BY DEFAULT SETTING بہتر کردے۔''

ہر روز اس نے ہاتھ اٹھا کر یہ دعا دل کی گہرائیوں سے مانگی۔ وہ اپنی شادی کو کسی سمجھوتے کی عمر قید کے طور پر نہیں گزارنا چاہتی تھی اور نہ اس میں یہ کمال تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے ایسا کرلیتی۔ پھر پہلے بچے کی پیدائش کے بعد دونوں کے درمیان دراڑیں کچھ اور گہری ہوگئیں، عاصم محمود کو اس کے ذوق کی خامیاں مزید نمایاں نظر آنے لگیں، ننھا معاذ دونوں کے درمیان میلان پیدا کرنے کے بجائے خلیج نمایاں کرتا گیا۔ وہ اس کو سلا کر جب تھک کر آنکھیں موند لیتی تو عاصم لاڈ دکھاتے ہوئے بچے کو اٹھا دیتا اور پھر معاذ جو رونا شروع کرتا تو چپ کرانا سندیلہ ہی کی ذمہ داری بنتا، گھر میں شور گونجتا تو ریموٹ سے ٹی وی چینل بدلتے عاصم محمود کے ماتھے پر شکنیں آجاتیں۔

''بھابی کو اتنی دیر نہ لگتی تھی بچے چپ کرانے میں تمہیں تو کوئی بھی

چیز اچھے طریقے پر نہیں آتی۔''

نیند سے سرخ ہوئی آنکھوں میں نمی سی تیر جاتی اور وہ کوئی سخت جواب دینا بھی چاہتی تو محض اس لئے نہ دیتی کہ گھر کی فضا میں معطر پن اگر نہیں ہے تو کڑواہٹ بھی نہ پھیلے۔

عاصم محمود اہنی اعصاب کا بے شک نہیں تھا لیکن کڑواہٹ کی فضا میں سندیلہ کی نسبت زیادہ آسانی سے جی سکتا تھا، سو چینل پہ چینل بدل کر اس کا دل بہل گیا اور سمجھوتے بھری زندگی میں ایک اور باب کا اضافہ ہو گیا۔

''بڑی عمر کا مرد!!'' وہ بھی معاذ کو چومتے اکثر بڑبڑا جاتی جو بالکل اپنے باپ کی شکل کا تھا ''میرا تو اس چھوٹے سے مرد نے خیال رکھا ہے!!'' معاذ کی روشن آنکھوں میں اس کو اپنا عکس جھلملاتا لگتا تو وہ محسوس کرتی جیسے وہ ایلس کے ونڈر لینڈ پہنچ چکی ہے، معاذ کی ہر ادا اس کو تحیر اور محبت کے ہالے میں لپیٹ لیتی۔''ایلس کا ونڈر لینڈ بھی اتنا حسین نہ ہوگا جیسا میرا بیٹا'' سندیلہ وارفتگی سے چمٹائے ہوئے کہتی۔

اس وقت عاصم محمود اس کے گمان و خیال کے کسی بھی حد میں نہ ہوتا، سمجھوتے اور گلے کسی درجے پر سوچ میں نہ آتے، بس سندیلہ ماں ہوتی، محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر۔

معاذ آٹھ ماہ کا تھا اور سندیلہ اکیس برس کی جب میاں بیوی میں اس لئے تلخی ہوئی کہ سندیلہ نے خاندان کی کسی شادی میں عاصم محمود کی پسند کا لباس پہننے سے معذرت کر لی تھی۔

''میں ساڑھی پہن کر معاذ کو نہیں سنبھال پاؤنگی۔'' عاصم محمود نے اس وقت تک تو اسے کچھ نہ کہا لیکن بھابی کو سی گرین سلک کی ساڑی میں دیکھ کر اسے سندیلہ پر دوبارہ طیش آ گیا اور پھر اتنا بڑھا کہ گھر آ کر اس نے پہلا جملہ جو کہا وہ یہ تھا۔

''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔''

معاذ کو بستر پر لٹاتی سندیلہ لمحہ بھر کو ساکت ہوئی اور پھر جھٹکے سے پلٹ کر اس نے میاں کے ہاتھ میں منہ دکھائی میں دی انگوٹھی تھما دی جس میں نیلم جڑے تھے۔

''یہ پکڑو اور باقی گنتی پوری کر دو'' اس کی آنکھوں میں خوف اور صدمے کے بجائے شیرنی کی سی خونخواری آ گئی تھی۔

عاصم محمود نے انگوٹھی مٹھی میں دبا کر اس کو گھورا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ نیلم سندیلہ کو راس کیا آتا، اس کے ہوتے بھی اس کی زندگی میں بھونچال آ گیا۔ حالانکہ یہ وہ پتھر تھا جو کہنے کے مطابق سندیلہ کے لئے نیک شگون تھا، اس لئے ہی عاصم محمود نے منہ دکھائی کے لئے اسے پسند کیا تھا۔ اور پھر دو سال وہ مزید سندیلہ محمود رہی، بالآخر سندیلہ کی عمر کے تئیسویں سال جب کہ دوسرا بیٹا طلال سال بھر کا تھا، تین طلاقوں کی گنتی کا اختیار عاصم محمود نے ختم کر دیا۔

''یہ بھی مرد کی عنقا خصوصیات میں سے ہے کہ وہ اختیار کو یکدم استعمال کرنے کے بجائے احتیاط سے برتے۔ میں نے بھی یہ کیا۔''

عاصم محمود کو اپنے بارے میں یہ خیال واضح تھا اور منظر نامے پر بھی یہ ہی ظاہر تھا۔

سندیلہ دونوں بیٹوں کے ساتھ اسی مقام پر آ چکی تھی جہاں سے وہ راج کرنے کے تصور کے تحت بے جوڑ رشتہ میں جوڑی گئی تھی۔ عاصم محمود کتنا بھی اچھا تھا بہر حال سندیلہ جیسی روح کے ساتھ اسکا کوئی جوڑ نہ تھا اور سندیلہ کی سوچوں میں کتنی بھی وسعت تھی بہر حال ایسی نہ تھی کہ عاصم محمود یا کسی بھی مرد کو جو فطری روایتی انا کی تسکین پا کر نہال کرتے ہوں، اس کو مطمئن کر سکے۔ آخری طلاق بھی عاصم محمود کی جانب سے وقفہ وقفہ سے طعنہ زنی کے بعد محض ایک جملہ کے جواب کے نتیجہ میں عمل میں آ گئی تھی۔ ''ٹھیک ہے میں ہوں ایسی، خاص تو آپ بھی نہیں'' یہ جملہ سندیلہ انعم کو تیسری طلاق دے گیا۔

'کیا شادی اپنے آپ کو فنا کر دینے کا نام ہے، اپنی ذات کی نفی کر کے دوسرے کو ضرب دینے کا نام ہے، کیا یہ محض سمجھوتوں کی لڑی ہے جو ایک بار بننی شروع ہو تو پھر لامحدود ہو جاتی ہے؟''

ڈبڈبائی آنکھوں سے وہ اکثر سوچتی۔ عاصم محمود اس سے اور بچوں سے اتنا لاتعلق ہو چکا تھا جیسے انکا وجود حقیقی دنیا میں موجود ہی نہ ہو۔ تین کی تکرار نے اسے محرم سے نامحرم بے شک کر دیا تھا لیکن رحم کے رشتے نہ کسی

دنیاوی دعووں سے بنتے ہیں اور نہ فنا ہوتے ہیں۔ آسمانی حکم ہی انکو تخلیق کرتا ہے اور پھر وہ زمین سے آسمان تک ثبت ہو جاتے ہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، عاصم محمود کی اولاد عاصم محمود اور سندیلہ ہی کی تھی چاہے عاصم محمود نے اپنی زندگی سے بظاہر انکو خارج کر دیا تھا۔ سندیلہ کی کمی اسے کبھی محسوس بھی ہوئی تو اس نے اس کمی کو پنپنے نہ دیا۔

ذمہ داریوں اور گھریلو فرائض سے آزاد زندگی عاصم کو نیّر جاوید کی قربت میں بے حد بھلی لگنے لگی۔ وہ مصور کی بے حد دلکش تخلیق لگتی تھی، ایسی تصویر جس پر کسی قدردان کی نگاہ فی الحال نہ پڑی تھی، ورنہ وہ اس فلورل شاپ کے کیش کاؤنٹر پر بیٹھنے کے بجائے کسی کے دل کے سنگھاسن پر بیٹھ کر راج کر رہی ہوتی۔ عاصم محمود کسی کاروباری تقریب میں شرکت کے لئے پھولوں کا گلدستہ خریدنے اپنی لگی بندھی دکان گیا تھا، نیر جاوید پھولوں کے درمیان، پھولوں کی مہارانی لگ رہی تھی۔ اس سے پہلے وہاں ایک عمومی سی وضع قطع کا شخص موجود ہوا کرتا تھا اور پھولوں کی قیمت بھی مناسب ہوا کرتی تھی۔ اب نہ وہ شخص تھا اور نہ پرانی قیمت۔ نیر جاوید تھی اور بلند قیمت..... جسے گاہک بڑی خوشدلی سے ادا کر رہے تھے، یہ قیمت صرف پھولوں کی نہ تھی بلکہ نیر جاوید کے وجود کی ہر دلکش ادا کی تھی۔ مترنم آواز سے لے کر مخروطی انگلیوں کے خوبصورت تراشے گئے ناخنوں کی ساخت کی۔

زنانہ نگاہوں میں مسابقت ابھر رہی تھی تو مردانہ نگاہوں میں وہ دلچسپی جس میں احترام اور وقار ناپید ہوتا ہے۔ مگر لگتا تھا نیر جاوید کو نہ تو مسابقانہ نظر اثر ڈال رہی تھی اور نہ حریصانہ۔ ایک نرم سا رویہ تھا جو بنا کسی تغیر کے چہرے پر چسپاں گاہک کھینچ رہا تھا اور وہ انکی جیب سے رقم سہولت سے نکلوا کر دکان چمکا رہی تھی۔

دکان کے دروازے کو باہر دھکیلتے عاصم محمود نے اس کرخت تاثر والے گارڈ کو دیکھا، جو نیر جاوید کی طرح نئی تبدیلی تھی، اسے اندر موجود گل بہار وجود کی اطمینان بھری بے نیازی کی وجہ بہ خوبی سمجھ آ گئی۔ پھول کی حفاظت رب کانٹے کی طاقت سے کرتا ہے۔ عورت کی بے حد قیمتی عزت و عصمت کی حفاظت رب نے اسکے محرم رشتوں کے حصار سے کروائی۔ اس حصار کے ساتھ اس کو محفوظ مزید رکھنے کے لئے اسے مخصوص دائرے کے سوا ہر ایک سے پوشیدہ کر دیا۔ قیمتی ہے مگر ہر ایک اس کو نہیں دیکھ سکتا، نازک ہے پر کوئی اسے چھو نہیں سکتا، دلکش ہے پر سب کی تفریح کا ذریعہ نہیں۔ نیر جاوید ان سب حصاروں کو پھلانگ کر اس دکان میں موجود تھی۔ سو اس کی حفاظت کا بندوبست دکان کے مالک نے اس گارڈ کے ذریعے کرنے کی کوشش کی تھی۔ گارڈ جو..... بس جسمانی حفاظت کر سکتا تھا، روح کو چھیدنے والی نگاہوں اور حرکات سے نگہبانی کرنے سے وہ قاصر تھا۔

نیر جاوید حفاظت کے اس بلند ترین معیار سے نا آشنا تھی، عاصم محمود کی شوقین نگاہوں سے اسے الجھن نہ ہوئی، اس کا لہجہ نیر جاوید کو معقول لگا، انداز شائستہ لگا اور پھر دونوں میں تعلقات استوار ہوتے چلے گئے۔ سندیلہ خیال و خواب کے کسی حصہ میں بھی نہ ٹھہر سکی اور عاصم محمود ایک نئی دنیا میں مگن ہو گیا..... بے فکر و آزاد پنچھی کی طرح!

زندگی ایسی ہی گزرتی رہتی تو کیا تھا! سختیاں تو سندیلہ کے حصے میں تھیں، بچے اس کی ذمہ داری تھے۔ باپ کی خوشحالی رفتہ رفتہ زوال پذیر ہو رہی تھی، اچھے دنوں کی عادتیں تکلیف دہ بن گئی تھیں۔ عاصم محمود کے لئے اس کے پاس سوائے بڑبڑاہٹ کے کچھ نہ تھا۔ ''زندگی عذاب میں ڈال دی اس آدمی نے میری'' وہ اب ہر صبح نوکری کے اشتہارات اور ان کے لئے انٹرویو کے مراحل کی تیاری کرتے ضرور بڑبڑاتی، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس کے ہونٹوں سے جملے ادا ہوتے جو کہ اس شائستہ سی سندیلہ کے وجود کا کبھی حصہ نہ رہے تھے۔ معاذ، طلال کی نشیلی آنکھوں میں اسے لگتا تھا کہ اداسی جم سی گئی ہے یا شاید اس کے اپنے دل کی کیفیات تھیں جو اسے اپنے بچے بھی غمگین لگتے تھے۔ ''باپ کے ہوتے بھی میرے بچے بنا باپ دنیا میں جی رہے ہیں، کوئی گھنا سایہ نہیں جوان کو زمانے کی دھوپ سے بچا سکے، کمزور قدموں کو سنبھال سکے۔'' وہ بے حد آزردگی سے سوچتی۔

نوکری تو اس کو مل چکی تھی۔ حساب کتاب میں وہ فطری طور پر تیز

تھی۔ اسے جاب بھی مقامی مصالحہ جات کمپنی میں اکاؤنٹنٹ کے شعبے میں مل گئی۔ معاش کا بوجھ اس نے اپنے اردگرد کسی عورت کو اٹھاتے نہ پایا تھا۔ یہ سب سہنا اس کے لئے آسان نہ تھا۔ چمپئی سی رنگت میں سانولا پن گھلنے لگا، بالوں میں کھردراہٹ آنے لگی۔ معیاری کاسمیٹک جوان سب کو ترو تاہ کر دیتا اس کو خریدنے میں وہ تنخواہ کا معقول حصہ خرچ کرنے کی متحمل نہ ہوسکتی تھی، اس کی جان اکیلی نہ تھی، اس نے اپنے بیٹے پالنے تھے اور وہ عادتیں بھلانی تھیں ہیں جن کی وہ عادی تھی۔ عمدہ معیار کی سبزی کا ذائقہ اسے سستی سبزی خریدتے یاد آتا تو وہ دل مسوس کے رہ جاتی۔ ''کون کہتا ہے چقندر بے ذائقہ ہوتے ہیں۔ اچھے دام دے کر اچھی سبزی لو۔ اچھے معیار کا تیل اور عمدہ مصالحہ جات میں اچھے گوشت کے ساتھ پکاؤ سواد آئیگا۔'' یہ اس کے ہی جملے تھے جو کبھی وہ گفتگو میں سبزی کی مخالفین کو کہتی تھی۔

سندیلہ کے باپ کا مزاج دن بہ دن تیکھا ہوتا جارہا تھا۔ طلاق کے وقت بے وقت رونے سے انکو غصہ آنے لگا تھا۔ ''اسکا باپ خود تو مزے کررہا ہے ہم پر مصیبت ڈال گیا۔'' وہ بڑبڑاتے تو سندیلہ کا دل کٹ کر رہ جاتا۔

اس نے زندگی کے دو بہت قریبی رشتوں کے مردوں کو عورت کے ساتھ ناانصافی کرتے پایا تھا۔ وہ حاکم بن کر محکوم کا ساتعلق عورت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ ہوش وحواس کے تمام دریچے بند کر کے ان کو بلند سے بلند کر دینے والی عورت ہی ان کو پسند تھی۔

گھر کی چار دیواری کی پسند باہر کی دنیا سے بے حد مختلف تھی۔ باہر وہ عورت کے ناز اٹھا کر خوش ہوتے تھے، گھر میں وہی مرد عورت سے جی حضوری کروا کر تسلی پاتے تھے۔ عجیب ہی پیمانے تھے اور عجیب ہی انداز۔ جو بیوی تھی، عاصم محمود نے اس کی ذاتی پسند کو کبھی اہمیت نہ دی جاوید کی پسند سے اس نے کبھی منہ موڑا نہیں۔ ایسے ہی سندیلہ کے والد نے سندیلہ کی والدہ کے لئے کبھی تعریفی کلمات کا تکلف نہ کیا، ہاں دوستوں کی بیویوں کے سگھڑ پن کی مثالیں وافر بیان کیں۔ دونوں ہی مردوں نے اپنی بیویوں کو سمجھوتوں کی صلیب پر چڑھا کر رکھا۔ سندیلہ کی والدہ نے اس صلیب کو تقدیر کا لکھا سمجھا اور کبھی کسی گاڑی میخ پرچوں تک نہ کی، وقت سرکا تو میخیں زنگ خوردہ ہو کر کچھ ڈھیلی ہوئیں تو وہ اس پر بھی شکر بجالائیں لیکن اس وقت تک ان کے اپنے اعضا اور قویٰ زنگ خوردہ ہو چکے تھے۔ عاصم محمود نے میخیں ٹھوکنے کے بجائے اسے زندگی ہی سے نکال پھینکا۔ اب زندگی سندیلہ کے لئے آزمائشوں کا دائرہ بن چکی تھی اور وہ بے حس اسمیں چکر کاٹ رہی تھی۔

اس گردش کے چوتھے سال اس کا رشتہ کسی ''بابا جی'' کے لئے آیا جو بچوں کو بھی ساتھ رکھنے کو بہ خوشی تیار تھے۔ بابا جی کا رشتہ لانے والی ان کی بہوئیں تھیں جو سندیلہ ہی کی ہم عمر تھیں لگ بھگ۔ انکی چال ڈھال اور گفتگو انکی خوشحالی کا واضح نشان تھی۔ حیرت تھی کہ سسر کے لئے وہ ایک جوان اپنی ہی ہم عمر ساس پسند کررہی تھیں۔

''ڈیڈی بڑے ترتیب پسند آدمی ہیں، انکے معیار پر پورا اترنا کمال ہوتا ہے۔ اللہ بخشے ممی ہر وقت الرٹ رہتی تھیں ہر چیز وقت راور بہترین طریقہ پر چاہئے۔'' دونوں نے بڑے سبھاؤ سے باتیں بتائیں۔ ڈیڈی فوٹو میں قابل قبول کسی حد تک تھے لیکن سندیلہ کے والد سے بلمشافہ ملنے تک ''بابا جی'' بن گئے تھے۔ فوٹو شاید دس برس قبل کا تھا۔ بظاہر ان کی صحت قابل رشک تھی لیکن عمر کے تفاوت کے اثرات بہرحال سندیلہ نے عملی اور جذباتی دونوں سطح پر سہنے تھے۔

''عبداللہ ناصر''

اس نے فوٹو پر واٹر مارک سے لکھا نام پڑھا اور دل میں گرتے آنسو پی کر ایک بار پھر منکوحہ بننے کا فیصلہ کرلیا۔ اب کی بار وجہ محض بچوں کا اچھا مستقبل تھا۔ گو اسے امید نہ تھی کہ وہ بیگم سے بیوہ بننے میں زیادہ وقت لگائے گی، یہ تو اسے اپنے بارے میں بھی نہ گمان تھا کہ وہ زیادہ جئے گی لیکن اوسط عمر اور انسانی توقعات کے ظاہری حساب کتاب نے اس کی بیوگی کے حدشات اس کے سامنے لا کھڑے کئے۔

''امی میرے دل میں کوئی گھنٹی نہیں بجی 'ڈیڈی' کو دیکھ کر۔'' سندیلہ نے ماں کی گود میں سر رکھ کر بھیگے لہجے میں کہا حالانکہ دل و دماغ اسے حقیقت، حالات اور ضرورت کے آئینے بہ خوبی دکھا رہے تھے۔ ''او

بی بی دل کی گھنٹی نہیں بنگلے کی گھنٹیاں سنو'' کھنکتی سی آواز میں یہ جواب سن کر اس نے چونک کر آواز کو دیکھا۔

''واؤ تم اچانک کیسے!!'' آنے والی سندیلہ کی پھوپی زاد کزن تھی۔

''بس تمہاری نیوز ملی اور میں یہاں آ گئی۔''

''صحیح بتا کہ تو کیسے آئی'' سندیلہ نے دوستانہ جرح کی تو حنا ہنس پڑی۔''

''ماموں نے فون پر تمہارے رشتے کا بتایا امی کو، میں نے سوچا مجھے تمہارے پاس موجود ہونا چاہئے سو میں آ گئی۔''

اس کی پھوپھی زاد نے تازہ تازہ بلو ڈرائی ہوئے بالوں کو جھٹکا دیتے خوشگوار لہجے میں کہا تو سندیلہ ہنس پڑی اور پھر حنا نے اس کے ساتھ کئی گھنٹے گزارے۔ جب وہ لوٹنے لگی تو سندیلہ کے لئے ''بابا جی'' کی بیگم بننا ناممکن سے ممکن دلی طور پر ہو گیا تھا۔

زندگی کا فلسفہ اس نے سندیلہ کو سمجھایا ''ایسی شادیاں محض تجارت ہوتی ہیں ڈیئر کزن، کچھ تمہاری مجبوری اور کچھ ان کی طلب۔ یہی لین دین ان کی بنیاد بنتا ہے۔ محبت اور وفاداری پائی جاتی ہے مگر بہت ممکن ہے نہ بھی پائی جائے کیونکہ دل مار کر زندہ رہنا بہت کٹھن ہے۔ تمہارے بچوں کا سنہرا مستقبل ''بابا جی کی بیگم'' بننے سے جڑا ہے، سودا ان کر دو اپنے آپ کو۔ اپنے آپ کو فنا کر کے بھی وہ کچھ مہیا نہ کر سکو گی جو اس شادی سے تمہیں اپنے جذبات مار کر ملے گا اور بیوگی تمہارے لئے گولڈن شیک ہینڈ ہو گی اگر.....''

یہاں وہ رک کر سندیلہ کے تاثرات دیکھنے لگی جو ہونق بنی اس کے اقوال سن رہی تھی۔ حنا نے ایک قہقہہ لگایا۔

''اگر تمہیں ان سے محبت نہ ہوئی، ورنہ تو فیری ٹیلز میں بیوٹی کو بیسٹ سے محبت ہو ہی جاتی ہے۔'' اس نے ایک بار پھر پر مزاح انداز میں ہنستے ہوئے سندیلہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے گلے لگا لیا۔

سندیلہ کے خاموش آنسو اسکے کندھے پر ٹپک گئے۔ اس نے دل سے اٹھتے غم کو ایک بار پھر ہنسی میں اڑاتے سندیلہ کو بھینچا اور پھر اگلے لمحے بیگ سے سندیلہ کی پسندیدہ چاکلیٹ نکال کر اسکے ہاتھ میں تھما دی۔

''یہ ایک تم کھا لو باقی ہم محلے میں بانٹ دیتے ہیں تمہاری شادی کی خوشی میں۔'' ڈبہ ہاتھ میں جھلاتے وہ اتنی خوش لگ رہی تھی کہ سندیلہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی، یوں ایک اعصاب شکن فیصلہ کچھ ہلکا ہو گیا۔

ہفتہ بھر بعد بنی سنوری وہ نکاح نامہ پر دستخط کرتے لمحہ بھر کو ٹھٹک گئی۔ بازوؤں میں موجود چوڑیاں کھنک اٹھیں، ناک میں پہنی لونگ کے ہیرے نے رنگ بدلا، ایک کپکپاہٹ سی تھی جو اس کے وجود پر چھا گئی۔

''سندیلہ!'' قریب میں موجود حنا جو اس کی کیفیت بہ خوبی جان رہی تھی سرگوشی میں پکاری۔ ''ہمت پکڑو'' اس کی آواز اور سندیلہ کے کندھے پر رکھے ہاتھ کو محسوس کرتے ہوئے سن ذہن کے ساتھ سندیلہ نے تحریری اور زبانی مرحلے گزار دیئے۔

''نہ جانے اماں جانی کدھر ہیں'' سندیلہ کا ماں کی گود میں چھپ جانے کو دل چاہا۔ وہ اس منظر سے کہاں غیر حاضر تھیں؟ اس نے بے قرار نگاہیں دوڑائیں۔ ''نہ معاذ نہ طلال!'' پھر دل نے انکو ڈھونڈا۔

''کیا ہی اچھا ہوتا اگر میں آصف کی پیشکش قبول کر لیتی'' ایک دم یہ خیال ابھرا اور اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ آصف جمال اس کی کمپنی کے باس تھے، جو اسے خفیہ نکاح کی آفر کر چکے تھے جسے اس نے بلا تردد مسترد کر دیا تھا۔ ''چھپے ہوئے خفیہ تعلقات انسان کے لئے کوئی خیر کبھی نہیں لاتے میں اپنی اور بچوں کی زندگی کسی مزید مشکل اور دردسری میں ڈالنے کی ہمت نہیں رکھتی۔''

آدمی ڈھنگ کا تھا۔ اس نے پھر اشارتاً بھی سندیلہ سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کی۔ وہ نہ جانے کیوں یاد آ گیا۔ شاید اس لئے کہ وہ اپنا جوڑ محسوس ہوتا تھا، مجبوری نہیں خوشی، برداشت نہیں رغبت لگتا تھا۔ بظاہر ان خصوصیات کے باوجود وہ اس لئے بے جوڑ تھا کہ وہ سندیلہ کی زندگی کو مزید تماشہ کر دیتا۔

وہ یہ سب سمجھ رہی تھی لیکن دل پھر بھی بے چین تھا۔

منکوحہ عبداللہ ناصر بنتے ہی عبداللہ ناصر نے اس کے لئے دودھ کا گلاس بھجوایا جسے آدھا پی کر بھیجا گیا تھا۔ سندیلہ نے نگاہ اٹھا کر کچھ فاصلے پر موجود عبداللہ ناصر کو دیکھا اور پہلا گھونٹ بھر لیا۔ لپ اسٹک کا نشان

فرحی نعیم

داستانِ دل

اسٹرا کے کنارے پر ٹھہر گیا تھا۔

''بہت ممکن ہے سندیلہ انعم کو اس طرح عبداللہ ناصر سے محبت ہو جائے۔''

گھونٹ در گھونٹ لئے وہ سوچ رہی تھی۔ گلاس خالی ہو رہا تھا اور اسکا سفر شروع۔ نہ جانے آگے صحرا تھا یا نخلستان، جو بھی تھا لیکن یہ بات طے تھی کہ اس کہانی میں بیوٹی کی محبت نے کسی پرنس کو وجود نہ دینا تھا۔☆

آج انکشافات کا دن تھا۔ حقائق کے ظہور پذیر ہونے کا دن، ایسی نا قابل یقین سچائی جسے ماننے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، لیکن دماغ چیخ چیخ کر اسے تسلیم کرنے پر آمادہ کر رہا تھا۔ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اُس کے لبوں سے نکل رہے تھے اور پشیمانی سے ثانیہ بھیگی آنکھوں سے وہ سب سن رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

''اماں آپ کو پتہ ہے آج پڑوس میں نئے لوگ آ گئے ہیں۔'' ثانیہ صحن میں بچھے تخت پر اماں کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی اور دھلے ہوئے کپڑے تہہ کرنے لگی جو وہ ابھی چھت پر سے اتار کر لائی تھی۔

''ہوں، اچھا۔'' اماں نے جو پٹاری کھولے پان لگا رہی تھیں سرسری جواب دیا۔

''ابھی میں چھت پر گئی تھی نا، کپڑے اتارنے تب دیکھا، کافی چہل پہل ہو رہی تھی۔ اوپر نیچے، کافی بڑی فیملی لگ رہی ہے۔'' ثانیہ نے مزید کہا۔ لیکن اماں نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ ''کسی دن چلیں گے ملنے۔'' ثانیہ پھر بولی۔

''ہاں ہاں، ابھی تو آئے ہیں، پہلے انہیں جم تو جانے دو، پھر دیکھیں گے۔''

اماں کی توجہ اب بھی ثانیہ یا پڑوس کی طرف کم اپنے پاندان کی طرف زیادہ تھی۔ ثانیہ اسی طرح کپڑے تہہ کرتے ہوئے ہلکی پھلکی باتیں کرتی رہی پھر کپڑے الماریوں میں رکھنے کے لئے تخت پر سے اٹھ گئی۔

پھر نئے پڑوسیوں کو آئے دس دن بھی ہو گئے اور ثانیہ ملنے کے لئے وقت نہیں نکال پائی۔ دونوں بچوں کے اسکول سے آنے کے بعد جو وہ ان کے کاموں میں لگتی تو عشا ہی ہو جاتی۔ آج تو اس نے پکا عہد کیا تھا کہ شام کو تھوڑی دیر کے لئے اماں کو لے کر ضرور ہی پڑوس میں جائے گی۔ بچوں کو اسکول کا کام جلدی جلدی کرا کر وہ پڑوس میں آ گئی تھی۔ بڑی خوشدلی سے ان ساس بہو کا استقبال کیا گیا تھا۔ ثانیہ نے گھر کے لئے آج کباب بنائے تھے۔ وہ ایک پلیٹ میں رکھ کر پڑوس میں لے گئی تھی کہ پہلی دفعہ خالی ہاتھ جانا اُسے کچھ مناسب نہ لگ رہا تھا۔

''ارے آپ نے یہ کیا تکلف کیا۔'' پڑوس کی بڑی بھابھی صفیہ بولیں۔

''تکلف کیا، آج کباب بنائے تھے میں نے، سوچا آپ کو بھی اس میں شریک کر لوں، کھا کے بتائیے گا کیسے بنے ہیں، ویسے آپس کی بات ہے میں کھانا بڑے مزے کا بناتی ہوں۔'' ثانیہ مسکراتے ہوئے بے تکلفی سے بولی تو جواب میں صفیہ بھابھی بھی ہنس پڑیں۔

''کباب تو دیکھنے میں ہی بڑے لاجواب لگ رہے ہیں تو یقیناً کھانے میں بھی ذائقہ دار ہونگے، کیوں انیلا؟'' بھابھی نے ثانیہ کو جواب دیتے ہوئے آخری جملہ اپنی نند سے کہا جو ان کے ساتھ ہی بیٹھی تھیں۔

''بالکل، گارنش بھی بہت اچھی طرح کی ہے۔'' انیلا نے اپنی

بھابھی کی بات میں مزید وزن پیدا کیا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم لوگ آپس میں بہنیں ہو یا دیورانی جٹھانی اور اس سے پہلے کہاں رہتی تھیں؟ کتنے بچے ہیں تمہارے؟'' اماں شاید اس ستائش باہمی سے بور ہوگئی تھیں تبھی فوراً اپنے مطلب پر آ گئیں۔ انہیں ثانیہ کے کبابوں کی تعریف سے زیادہ پڑوسیوں کے بارے میں جاننے سے دلچسپی تھی جبھی انہوں نے پے در پے کئی سوالات کر ڈالے۔

''خالہ ہم نہ بہنیں ہیں نہ دیورانی جٹھانی بلکہ ہم تو نند بھاوج ہیں۔ البتہ میری ایک جٹھانی اوپر والے پورشن میں رہتی ہیں۔ ہم دونوں کی فیملی نیچے رہے گی۔'' صفیہ مسکرائیں۔ ''اور میرے دو بچے ہیں اور بڑی بھابھی کے 4 بچے ہیں۔ انیلا کا ایک ہی بیٹا ہے۔'' انہوں نے اماں کے سوالوں کے یکے بعد دیگرے جوابات دیئے۔

''اور ہم اس سے پہلے گلشن میں رہے تھے۔''

''اچھا اور تمہارے میاں، وہ کیا کام کرتے ہیں؟'' اب اماں نے ایک اور سوال کیا۔ ''میرے میاں پاسپورٹ بنانے والے دفتر میں افسر ہیں۔'' صفیہ نے بڑے آسان لفظوں میں اماں کو اپنے شوہر کی جاب کے بارے میں بتایا۔ ''جیٹھ کا اپنا دوائیوں کا اسٹور ہے۔''

اماں جس طرح کے سوالات کر رہی تھیں اسی طرح ان کو جواب بھی بڑے تسلی بخش مل رہے تھے۔

''اور تمہارے میاں؟'' اب اماں کا رخ انیلا کی طرف تھا لگتا تھا وہ آج ہی ان کے گھرانے کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لیں گی۔ ثانیہ کو ساس کا اس طرح سوال پر سوال کرنا انتہائی غیر مناسب لگ رہا تھا لیکن مجبور تھی کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی مبادا ساس اُس سے ہی خفگی کا اظہار کر دیں۔

''ارے انیلا مہمانوں کے لئے چائے، ٹھنڈا کچھ تو لے کر آؤ۔''

صفیہ بھابھی نے ایک دم انیلا کی طرف گردن گھمائی۔

''ہاں ہاں، میں چائے بنا لاتی ہوں۔'' انیلا، بھابھی کے اشارے پر فوراً ہی اٹھ گئی اور تھوڑی ہی دیر میں وہ چائے کے ساتھ کیک بسکٹ لے حاضر ہوئی۔

''ارے بس چائے لے آتیں یہ اتنے اہتمام کی کیا ضرورت تھی!'' ثانیہ کچھ شرمندگی سے بولی تھی۔

''جو گھر میں تھا وہ حاضر ہے آپ خالہ یہ لیں'' انیلا نے پلیٹ میں کیک کا ٹکڑا کاٹ کر ثانیہ کی ساس کے آگے رکھا، ثانیہ نے بھی چائے کی پیالی اٹھالی اور چائے کے دوران وہ چاروں ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ ایک گھنٹہ کے بعد جب ثانیہ اور اماں اپنے گھر کو لوٹیں تو پڑوس کے لئے ان کے دل میں بڑے اچھے جذبات تھے۔

''اچھے لوگ ہیں نا؟'' ثانیہ گھر آ کر چادر اتارتے ہوئے اماں سے بولی۔

''ہوں''

''اچھے پڑوسی بھی خدا کا تحفہ ہوتے ہیں۔'' ثانیہ کچھ زیادہ ہی متاثر تھی۔ ''مجھے تو انیلا بہت اچھی لگی۔ نرم اور ٹھہر ٹھہر کے گفتگو کرنے والی۔''

''یہ اچھا ہے صفیہ کا جیٹھ دوائیوں کا کام کرتا ہے اب ایاز سے کہنا اسی سے دوا لے لیا کرے گا۔ بازار سے اتنی مہنگی دوائیاں آتی ہیں، ہوسکتا ہے یہ کچھ رعایت کر دے پڑوس سمجھ کر۔'' اماں کہہ رہی تھیں اور ثانیہ دل میں ہنس دی لیکن بظاہر سر ہلا کر اماں کی تائید کرنے لگی۔

''ارے یہ صفیہ نے انیلا کے میاں کے بارے میں دیکھو کچھ نہ بتایا، میں نے بعد میں انیلا سے پوچھا تو اس نے بھی ٹال دیا۔'' اماں کو دونوں نند بھاوج کا اس موضوع سے گریز کھٹک رہا تھا۔

''ارے چھوڑیں اماں، یہ بتائیں رات کو آپ کھانے میں کیا لیں گی، چاول تو دوپہر میں لے لئے تھے اب روٹی پکا دوں؟''

''ہاں پکا دو، لیکن بتانے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ کوئی تو بات ہوگی۔'' اماں کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ ثانیہ نے ایک نظر ان کو دیکھا پھر سر جھٹکتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔ بچے اُسے آواز دے رہے تھے۔ وہ اماں کی عادت جانتی تھی اب جب تک انہیں انیلا کے میاں کے بارے میں مکمل معلومات نہیں مل جاتیں وہ اسی طرح بے چین ہی رہتیں۔ یہ نہ تھا کہ انہیں کن سوئیاں لینے کی عادت تھی لیکن اپنے میل جول کے

بارے میں وہ ہمیشہ مکمل تفصیلات سے باخبر رہنا پسند کرتی تھیں۔ اور آج بھی یہی ہوا تھا صفیہ کے مقابلے میں انیلا کی ادھوری معلومات نے انہیں تجسس میں مبتلا کر دیا تھا۔

اس کے بعد وقتاً فوقتاً ثانیہ اور صفیہ بھابھی کی ملاقاتیں ہوتی رہتیں تھیں۔ دونوں خاندانوں کے تعلقات میں خوشگوار اضافہ وقت کے ساتھ ساتھ ہونے لگا تھا۔ نیچے کے دو کمرے صفیہ کے پاس تھے اور ایک کمرہ انیلا اور اس کے بیٹے کے پاس۔ اوپر صفیہ کی جٹھانی رہتی تھیں۔ ثانیہ ہفتے میں ایک چکر تو ضرور لگاتی اسے انیلا سے ملنا، باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ انیلا کی سادگی اس کا دھیما پن اور اس کا پرخلوص انداز ثانیہ کو بہت متاثر کرتا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جو ثانیہ کے بیٹے کا ہم عمر تھا یوں دونوں بچوں میں بھی دوستی ہو گئی تھی۔

ثانیہ نے اکثر یہ بات نوٹ کی تھی کہ انیلا کی باتیں صرف اپنے بہن بھائیوں اور اپنے میکہ تک ہی محدود ہیں۔ وہ بھولے سے بھی اپنے شوہر یا سسرال والوں کا ذکر نہیں کرتی تھی۔ چونکہ ثانیہ کی عادت بھی زیادہ کریدنے کی نہیں تھی لہٰذا اس نے انیلا کے اس موضوع سے اجتناب کے باعث، کبھی اس سے اس کے سسرال کے بارے میں نہ پوچھا اور نہ ہی کبھی شوہر کے متعلق جاننے کی کوشش کی۔ بڑھتی ہوئی دوستی کے باعث اتنا تو وہ جان گئی تھی کہ انیلا کے بھائی ہی اس کا خرچہ اٹھاتے ہیں۔ آج انیلا کافی دنوں کے بعد ثانیہ کے پاس آئی تھی۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ چلی گئی۔ یہ اتفاق تھا کہ اماں اس وقت سو رہی تھیں وہ جب جاگیں تو انیلا گھر جانے کے لئے اٹھ چکی تھی۔ اماں سے سلام دعا کر کے وہ چلی گئی۔

''یہ کب آئی؟'' اماں نے اپنا چشمہ ٹھیک کرتے ہوئے ثانیہ سے پوچھا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمارے برتن دینے آئی تھی، میں نے بٹھا لیا۔''

''ارے اماں چھوڑیں۔'' ثانیہ حسب معمول لاپروائی سے بولی اور شربت کے گلاس اٹھانے لگی جو اس نے انیلا کے آنے پر بنایا تھا۔

''اے پھر بھی، پوچھو تو، میاں زندہ ہے یا مر چکا؟ یا یہ خود ہی میاں کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔

''اماں مجھے نہیں اچھا لگتا اس طرح ٹوہ رکھنا۔'' اماں کو جتنا انیلا کے حالات جاننے کی فکر تھی اس کے برعکس ثانیہ اتنا ہی احتیاط برتتی۔

''اے لو اس میں ٹوہ رکھنے کی کیا بات۔'' اماں برا مان گئی تھیں۔'' بھئی وہ تمہاری سہیلی ہے، پڑوسن ہے اب اتنا تو پوچھنا حق بنتا ہے۔'' اماں کی اپنی لاجک تھی۔

''اماں جب وہ خود بتانا پسند نہیں کر رہی تو مجھے بھی اس طرح پوچھنا اچھا نہیں لگتا۔ خود بتائے گی تو پتہ چل جائے گا۔''

''لگتا ہے زیادہ ہی معاملات خراب ہیں میاں اور سسرال سے، ارے کبھی صفیہ سے پوچھو یا اس کی جٹھانی ثمینہ سے۔'' اب اماں کو نئی سوجھی۔ ''یہ آج کل کی لڑکیاں ذرا ذرا سی بات پر سسرال چھوڑ کر میکے آ بیٹھتی ہیں۔ برداشت تو ہے ہی نہیں۔''

''اماں کیا فائدہ'' ثانیہ نے پھر دامن بچایا۔ ''نہ جانے کیا بات ہو۔''

''ہوسکتا ہے کہ اس کا میاں مر چکا ہو لیکن اگر اس کا انتقال ہوا ہوتا تب تو بیویاں ضرور اپنے شوہروں کا ذکر کرتی ہیں۔ اس طرح تھوڑی پہلو بچاتی ہیں شوہر کے ذکر سے، چاہے اچھا ہو یا برا۔'' ثانیہ نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

''ضرور انیلا نے اُس کو چھوڑ دیا تبھی تو بات نہیں کرتی۔ لیکن کم از کم برا ہی کہے، کہ میاں کو چھوڑ کر بھائی کے گھر کیوں بیٹھی ہے۔''

''کچھ تو بتائے۔'' اماں کی بے چین طبیعت انہیں بے کل کیے تھی۔ ''تم بھی عجیب فطرت کی لڑکی ہو، اتنا دوستانہ ہے لیکن مجال ہے جو تم اس سے کچھ معلوم کرو، یا تم کو معلوم ہے اور مجھے نہیں بتانا چاہتیں؟'' بات کرتے کرتے اچانک ہی ایک اور وہم اماں کو آیا تھا کہ شاید ثانیہ ان کو اس سے لاعلم رکھنا چاہتی ہے۔

ثانیہ اس اچانک حملے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ جو اتنی دیر سے ہاتھ میں ٹرے لئے کھڑی اماں کی باتیں سن رہی تھی چونک گئی فوراً ہی ہاتھ سے ٹرے واپس میز پر رکھی۔

''ارے اماں میں نے سچ مچ نہ اُس سے کچھ پوچھا نہ اس نے ہی مجھے بتایا۔ جب اس کا اپنے شوہر سے کوئی تعلق ہی نہیں تو پوچھنے یا بتانے کا کیا فائدہ۔ ویسے بھی مجھے اس کے شوہر سے کیا لینا دینا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ایک دفعہ ہانی نے اس کے بیٹے عدنان سے اس کے پپا کے متعلق کھیل کے دوران پوچھ لیا تھا تو عدنان نے کہا تھا اس کے پپا کوریا میں رہتے ہیں، وہیں جاب کرتے ہیں، بس اس سے زیادہ کچھ نہیں پتہ..... میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

☆.....☆.....☆

انیلا اور اس کے بھائیوں کو ثانیہ کے پڑوس میں رہتے ہوئے سال ہونے کو آیا تھا۔ اماں کا تجسس اپنی جگہ پر اب تو ثانیہ بھی انیلا کا ماضی جاننا چاہتی تھی کیونکہ وہ بھی اب انیلا کے متعلق شبہات میں مبتلا ہوتی جا رہی تھی لیکن اس کا مزاج اور عادت ایسی نہ تھی کہ وہ خود سے انیلا سے کچھ پوچھتی۔ اب بس وہ اس انتظار میں تھی کہ انیلا کبھی خود ہی کوئی ذکر چھیڑ ے تو وہ اس سے اس کے ماضی کے متعلق معلوم کرے اور پھر ساری کہانی اماں کو بتا کر، ان کی بے چینی کو چین میں بدل دے اور پھر ایسا موقع خود انیلا نے ہی اس کو فراہم کر دیا تھا۔

ثانیہ گھر کے کام ہی نبٹا رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ انیلا تھی۔

''آؤ انیلا'' ثانیہ نے حسب معمول مسکرا کر اندر آنے کی دعوت دی۔

''ثانیہ تم سے ایک کام ہے۔''

''ہاں ہاں بتاؤ۔''

''آج دراصل بھائی کے دوست کی بہن کی شادی ہے۔ دونوں بھائیوں کی فیملی رات کو وہاں جائیں گی۔ واپسی میں ان لوگوں کو دیر ہو جائے گی کیونکہ شادی ہال یہاں سے کافی دور ہے۔ پھر کل بچوں کے اسکول کی بھی چھٹی ہے تو یوں بھی سب کو بے فکری ہے۔'' وہ کہتے کہتے رکی پھر ہچکچاتے ہوئے ثانیہ کو دیکھا جو سوالیہ چہرہ لیے انیلا کو ہی دیکھ رہی تھی۔ ''اصل میں، میں یہ چاہ رہی تھی کہ جب تک بھائی آ نہیں جاتے تم میرے پاس رک جاؤ۔ میں اور عدنان گھر میں اکیلے ہونگے اس لئے.....''

''تو تم نہیں جاؤ گی؟'' ثانیہ نے پوچھا۔

''نہیں میں اس طرح دوستوں میں کہیں نہیں جاتی۔'' وہ پھر اٹکتے ہوئے بولی ''تم کو اگر کوئی مسئلہ نہ ہو تو کیا تم دو تین گھنٹے کے لئے آ جاؤ گی؟'' انیلا کے لہجے میں التجا تھی۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں، گھر پر کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میں رات کو سب کو کھانا دے کر آ جاؤں گی، تم پریشان نہ ہو۔'' ثانیہ کو ایک دم ہی اس پر پیار اور ترس آیا۔

''ابھی پچھلے دنوں پیچھے محلے میں چوری ہوئی ہے نا تو اس وجہ سے مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ ورنہ میں تمہیں زحمت نہ دیتی۔''

''اچھا بس زیادہ تکلفات دکھانے کی ضرورت نہیں، ہم دوست ہیں اور دوستی میں کوئی شکریہ کوئی معذرت نہیں ہوتی میں آ جاؤں گی اور کیا کھڑے کھڑے ساری باتیں کرو گی اندر تو آؤ۔'' ثانیہ بے تکلفی سے بولی۔

''نہیں بس شکریہ، اب رات کو ملاقات ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ واپس پلٹ گئی۔ ثانیہ نے اماں، بچوں اور شوہر کو کھانا کھلایا خود بھی کھایا اور کچن سمیٹ کر میاں سے اجازت لے کر انیلا کے پاس آ گئی۔ انیلا اُسی کا انتظار کر رہی تھی۔ دونوں بیڈ پر بیٹھ کر ادھر اُدھر کی گفتگو میں مگن ہو گئیں۔ انیلا نے ثانیہ کے لئے مزیدار فرائڈ چکن اور چاٹ وغیرہ بنا رکھی تھی۔ ثانیہ کے نہ نہ کرنے کے باوجود اُسے زبردستی کھلاتی رہی۔ دونوں سہیلیاں اسی طرح اپنی اپنی باتیں کرتی رہیں۔ زیادہ تر ثانیہ ہی بولتی رہی انیلا تو بیچ بیچ میں اس کا ساتھ دیتی رہی۔

''انیلا تمہارے والدین کی ڈیتھ کو کتنا عرصہ ہو گیا۔'' ثانیہ نے انیلا کو اپنے والدین کے بارے میں بتاتے بتاتے اچانک ہی پوچھا۔

''بہت عرصہ ہو گیا۔'' انیلا پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی۔

''تمہاری شادی سے پہلے یا بعد میں، اتفاق ہے کہ ہماری اس موضوع پر کبھی بات ہی نہ ہوئی۔'' ثانیہ جوس پیتے ہوئے عام سے انداز میں بولی۔

''ہاں کبھی ہمارے درمیان یہ موضوع آیا بھی تو نہیں۔'' انیلا سنجیدگی سے بولی۔''میرے والدین اُس وقت ایک حادثے میں ہمیں چھوڑ گئے جب میں میٹرک میں پڑھتی تھی۔میرے ایک بڑے بھائی اور بہن کی اُس وقت شادی ہو چکی تھی۔میرے یہ دونوں بھائی جو اس گھر میں رہتے ہیں ابھی کنوارے ہی تھے۔اس طرح امی ابو کے انتقال کے تقریباً بیس سال ہو چکے ہونگے۔''

''کیا ہوا تھا تمہارے والدین کے ساتھ؟'' ثانیہ بھی کچھ رنجیدہ ہوگئی تھی۔

''کار ایکسیڈنٹ، امی ابو دونوں گاڑی میں جا رہے تھے کہ ایک ٹرک سے گاڑی ٹکرا گئی۔دونوں موقع پر ہی.....'' انیلا کی آواز بھرا گئی۔ ''پھر ہم تینوں بہن بھائی کی شادی ہمارے بڑے بھائی اور بہن نے ہی کی انہوں نے ہی ہمارے ماں باپ بن کر ہمیں سنبھالا۔

''بہت دکھ ہوا تم کو تو بہت چھوٹی عمر میں ہی والدین سے جدائی کا صدمہ اٹھانا پڑا'' ثانیہ بھی دکھی ہو چکی تھی۔

''صدمہ!! میری زندگی میں صرف یہی ایک صدمہ نہیں آیا بلکہ میری زندگی تو صدمات سے بھری پڑی ہے۔اولاد اور ماں باپ کا تعلق کیا ہوتا ہے، یہ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے، پہلے کچی عمر میں والدین سے جدائی اور پھر ماں بن کر اولاد سے جدائی۔میں تو کرچی کرچی ہو چکی ہوں۔'' صدموں سے چور وجود ہے میرا'' انیلا دور خلاؤں میں گھورتی ہوئی آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔

ثانیہ خاموشی سے انیلا کو بولتا سن رہی تھی۔انیلا چپ ہوئی تو ثانیہ تب بھی کچھ نہ بولی۔کتنے ہی لمحے یونہی چپ چاپ سرک گئے۔

''ثانیہ تم بہت خوش نصیب ہو کہ تمہارے رشتوں کے خوشگوار تعلق کی دولت موجود ہے۔والدین اور اولاد، کیسا پیارا، کیسا قیمتی تعلق ہے یہ، دنیا کا سب سے انمول رشتہ، سب سے نایاب، جس کا کوئی بدل نہیں۔'' انیلا گھٹنوں میں سر رکھے، چادر پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''انیلا کیا تم اپنا دکھ مجھ سے شیئر کرنا پسند کروگی؟'' ثانیہ بہت دھیمی آواز میں جھجکتے ہوئے بولی۔

جواب میں انیلا نے بڑی زخمی نگاہوں سے ثانیہ کو دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔

''اگر تم بتانا نہیں چاہتیں تو میں ہرگز تم سے اصرار نہیں کرونگی'' ثانیہ ایک دم بوکھلا کر بولی۔

''نہیں ثانیہ تم کو میں کیوں نہیں بتاؤنگی، میرا اور تمہارا تعلق تو بہت پیارا ہے۔ہم تو بہنوں کی طرح ہیں اور بہنوں سے بھی بھلا کوئی پردہ ہوتا ہے مجھے تو تم پر بڑا مان ہے۔تم نے آج تک مجھ سے کچھ بھی میرے متعلق نہ پوچھا۔حالانکہ آج سے پہلے جتنے لوگوں سے میرا واسطہ پڑا انہیں مجھ سے زیادہ میرے ماضی کو جاننے میں دلچسپی رہی۔لیکن تم نے تو کبھی ایک بار بھی نہیں کریدا۔'' انیلا اتنا کہہ کر پھر خاموش ہوگئی۔ثانیہ نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا وہ انیلا کے ہی بولنے کی منتظر رہی۔

''تعلق، تعلق کیا ہوتا ہے؟ رشتے کیا اہمیت رکھتے ہیں؟ میرا تو روم روم رشتوں کی حکایت سنا سکتا ہے۔'' انیلا کا چہرہ ضبط کی کوشش میں سرخ ہوا جا رہا تھا۔

''تم جانتی ہو ثانیہ، رشتے پیاز کی طرح ہوتے ہیں جس کا ہر پردہ دوسرے پردے کے ساتھ محبت سے جڑا ہوتا ہے۔اس کو جدا کرو گے تو صرف آنسو ملیں گے۔اور یہ آنسو میرا مقدر ہو چکے ہیں۔''

''خدا نہ کرے، تم کیسی باتیں کر رہی ہو'' ثانیہ نے گھبرا کر کہا۔

''اصل میں تم وہ سب نہیں جانتی نا، جب جان لوگی تو میری ہم نوا ہو جاؤ گی۔میری شادی آج سے پندرہ سال پہلے میری بہن بھائیوں نے کر دی۔والدین تو حیات نہیں تھے۔چاچا ماموں کو رشتہ مناسب لگا، بھائیوں نے کچھ چھان بین کی اور ہاں کر دی۔میں ابھی پڑھ رہی تھی۔ بڑا زور لگایا کہ میرا گریجویشن تو مکمل ہونے دیں لیکن .....بس مجھے رخصت کر دیا گیا۔میرے شوہر ساجد مزاج کے تیز اور غصیلے قسم کے بندے تھے۔وہ اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتے تھے۔میں سسرال میں بڑا پھونک پھونک کر قدم رکھتی۔یہ سمجھو کہ اپنے میاں سے اتنا ڈرتی کہ سانس بھی ان کی مرضی سے لیتی۔رات دن ان کی اور انکے گھر والوں کی خدمت کرتی لیکن اس کے باوجود مجھے چھوٹی

چھوٹی غلطیوں پر بڑا سخت سننا پڑتا۔حتیٰ کہ کبھی کبھی تو میرے شوہر غصہ میں تشدد پر بھی اتر آتے، پہلے دو بچے میرے اسی وجہ سے ضائع ہو گئے۔ پھر کچھ اپنے گھر والوں کے کہنے سننے پر انہوں نے میرے اوپر سختی کم کی۔ ادھر میرے بھائی نے بھی ان کو سمجھایا یوں کچھ عرصہ کے لئے میرے اوپر کچھ سختیاں کم ہوئیں اور اسی دوران میں دو بیٹوں کی ماں بن گئی۔ رات دن کولہو کے بیل کی طرح کام کرتی اور صلے میں مجھے ان کی صلواتیں ہی سننے کو ملتیں۔ نہ جانے وہ کیسا آدمی تھا جو بیوی کو پاؤں کی جوتی سے زیادہ کوئی اہمیت نہ دیتا۔ میں تو والدین کو ترسی ہوئی تھی لہٰذا مجھے اپنے بچوں سے بہت محبت تھی اور پھر کسی ماں کو اپنی اولاد سے محبت نہیں ہوتی۔ ساجد کو میری اس کمزوری سے فائدہ اٹھانا آتا تھا۔ وہ میری چھوٹی چھوٹی غلطیوں کی سزا یہ دیتا کہ مجھے گھر سے نکال دیتا اور بھائیوں کے پاس بھیج دیتا اور بچوں کو خود رکھ لیتا۔ پھر جب تک اپنی انا کی تسکین نہ کر لیتا مجھے واپس نہ آنے دیتا۔ بہت ظالم شخص تھا وہ۔'' انیلا نے ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنے آنسو پونچھے۔ ثانیہ دم سادھے اُس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

''وہ بھی ایک ایسا ہی خوفناک دن تھا۔ میری زندگی کا تاریک دن۔ میرا بڑا بیٹا اس وقت سات سال کا اور چھوٹا چار سال کا تھا۔ چھوٹے کو ڈائریا ہو گیا تھا۔ قے اور موشن اُسے لگے ہوئے تھے۔ ساری رات وہ بے چین رہا۔ صبح ساجد کو میں نے بچے کی بیماری کا بتایا لیکن وہ مجھے ہی ڈاکٹر کے ہاں جانے کا کہہ کر خود تو کام پر چلے گئے میں پہلے ہی بچے کے پیچھے بے حال تھی۔ نہ میں بڑے والے کو اسکول بھیج سکی نہ ہی گھر کا کوئی کام کر سکی۔ روٹی، ہنڈیا، سب کے کپڑوں پر استری کچھ نہ ہوا چھوٹا بیٹا مجھے اپنے پاس سے اٹھنے ہی نہ دے رہا تھا۔ کچھ دیر کے لئے وہ سویا تو میں صرف اس کے گندے کپڑے ہی دھو سکی۔ پھر دس بجے میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی بڑے والے کو بھی ساتھ لے لیا تھا کہ وہ ساتھ رہے گا میرے تو بھائی کو دیکھ لے گا۔ کچھ تو مجھے دوسرا ہٹ کا احساس ہوگا۔

ڈاکٹر کے ہاں رش بہت تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں میڈیکل اسٹور سے دوائیاں لینے لگی۔ وہاں مجھے اپنی بہن مل گئیں وہ وہاں سے قریب ہی رہتی تھی۔ انہوں نے جو مجھے اور بیٹے کو اس حال میں دیکھا تو زبردستی اپنے گھر لے گئیں۔ مجھے ناشتہ کرایا کیونکہ صبح سے میں نے بھی کچھ نہ کھایا تھا۔ بیٹے کو ہسپتال میں بھی الٹی ہو گئی تھی۔ اسکو صاف ستھرا کر کے اپنے بچے کے کپڑے پہنائے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اگر دوا سے فرق نہ لگے تو شام تک اسے ایڈمٹ کروا دیجئے گا۔ میں اکیلی کیا کرتی۔ بہن نے مجھے حوصلہ دیا۔ وہیں گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔

بچے کی طبیعت کچھ سنبھلی تب بہن نے مجھے جانے دیا لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں گھر آ گئی بھانجے کے ساتھ تو گھر میں بھونچال آ چکا تھا۔ ساجد اور ان کے گھر والے میری ازدواجی زندگی کو آگ لگانے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ انہوں نے نہ تو بچے کی حالت دیکھی اور نہ ہی میری ایک سنی۔ مجھے صفائی کا موقع دیئے بغیر مجھے خوب مارا کہ میں اتنی دیر بغیر بتائے کہاں غائب رہی۔ اپنے بھائیوں کے گھر بھی نہ تھی تو کہاں چلی گئی تھی۔ ساجد تو تھے غصے کے تیز ان کے گھر والوں نے بھی اس وقت انہیں خوب بھڑکایا۔ ساجد نے بغیر سوچے سمجھے نہ صرف گھر سے نکالا بلکہ مجھے طلاق بھی دے دی اور میرے دونوں بیٹے بھی مجھ سے چھین لیے۔ میں خوب روئی، تڑپی لیکن اس پتھر دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے بچے کی بگڑتی حالت کا بھی خیال نہ کیا اور میرے بھانجے کے ساتھ ہی مجھے گھر سے روانہ کر دیا۔ میں بھائی کے گھر آ گئی۔ بھائیوں نے اگرچہ صلح صفائی کرانے پر بہت زور دیا لیکن معاملہ اب ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ ساجد مجھے طلاق دے چکا تھا۔ میں نے بچوں کے لئے اس سے بہت منت سماجت کی، بھائیوں نے بھی پورا زور لگایا لیکن اس ظالم نے اس کے بعد مجھے بچوں کی شکل بھی نہ دیکھنے دی۔

میری حالت بہت خراب تھی میں تو شاید اپنے بیٹوں کے غم میں مر ہی جاتی کہ پھر میرے ساتھ میرے اللہ نے ایک معجزہ دکھا دیا۔ میں ایک بار پھر ماں بننے والی تھی، جس کی خبر مجھے نہ تھی تو ساجد کو کیسے ہوتی وہ تو میری گرتی ہوئی طبیعت دیکھ کر بھابھی مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں تو اس نے مجھے یہ نوید سنائی۔ میں جو مرنے والی ہو گئی تھی تو دوبارہ سے جی اٹھی اب مجھے اس بچے کے لئے زندہ رہنا تھا۔

عدنان کو میں نے اس کے باپ اور ددھیال سے چھپا کر پالا ہے ۔ہم نے کئی گھر بدلے اسی لئے کہ کہیں ساجد اس کو مجھ سے چھین نہ لے۔ عدنان کو تو میں نے یہی بتایا ہے کہ اس کے پپا کوریا میں ہیں ۔لیکن میں کئی سال گزرنے کے باوجود اپنے بڑے بچوں کی جدائی کے غم میں ڈوبی ہوئی ہوں ۔اس دنیا میں صرف عدنان ہی میرے جینے کا سہارا ہے۔ میرے بھائیوں نے میرا بڑا ساتھ دیا ۔سب ہی میری دلجوئی کرتے ہیں ۔بہن اب بھی پشیمان ہیں کہ کیوں وہ مجھے اس دن اپنے گھر لے گئیں ۔لیکن میں ان سے یہی کہتی ہوں کہ میرے مقدر میں یہی تھا تو پھر ان کا کیا قصور۔''

انیلا نے اپنی آنسو بھری داستان ایک آہ بھر کر پوری کی ۔ثانیہ بت بنی صدمہ سے گنگ انیلا کو سن رہی تھی ۔آنسو صرف انیلا کے ہی نہیں ثانیہ کی آنکھوں سے بھی بہہ رہے تھے۔

''انیلا تم .....تم بہت باہمت ہو جو اتنا بڑا غم اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہو مجھے معاف کردو میں نے تم کو غم زدہ کردیا۔'' ثانیہ بھیگی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی ۔''لیکن تمہارا قصور اتنا بڑا تو نہ تھا جتنی بڑی سزا تم کو دی گئی۔''

''اس کا فیصلہ تو جس نے کرنا تھا کردیا۔'' انیلا اتنا کہہ کر گھٹنوں میں سر رکھ کر پھر رونے لگی تھی۔

''انیلا .....انیلا'' بس چپ کر جاؤ'' ثانیہ نے انیلا کا ہاتھ تھاما اور اُس کا چہرہ اوپر کر کے اُس کے آنسو پوچھنے لگی لیکن شاید انیلا کے زخم اس وقت پھر ہرے ہو گئے تھے کہ وہ ثانیہ کے گلے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی مگر ثانیہ کے بہتے آنسوؤں میں پشیمانی ،شرمندگی اور دکھ کا احساس بڑا گہرا تھا۔ وہ ساری بدگمانیاں جو اماں اور اس کے دل میں سال بھر سے پنپ رہی تھیں، ثانیہ کو وہ احساس رلائے جا رہا تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ ہم کتنی آسانی سے دوسروں کے بارے میں گمان قائم کر لیتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

حمیرا بنتِ فرید

کارساز

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ

مسجد سے تلاوت کی آواز آ رہی تھی ۔ افزا کے کانوں میں یہ آواز گونجی اور وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی ۔ جب بھی وہ اس آیت کی تلاوت کرتی یا سنتی تو اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب سی ہونے لگتی اور بے خود سی ہو کر وہ سجدے میں چلی جاتی ۔ وہ سجدہ جس سے وہ سر اٹھاتی تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوتا لیکن اس پر ایک گہرا سکون چھایا ہوتا ، بالکل ویسے ہی جیسے سخت گرج چمک اور تیز بارش کے بعد ہوا کے ٹھنڈے جھونکے اور بادلوں کے پیچھے سے جھانکتی نرم گرم سورج کی کرنیں موسم کو خوشگوار کر کے ماحول کو پرسکون بنا دیتی ہیں ۔

یہ سجدہ شکر بعض دفعہ اتنا طویل ہو جاتا کہ گھر کے مکین تو گھبرا ہی جاتے ۔ اس دن بھی راشد کے آواز دینے پر افزا نہ جانے کتنی مدت بعد اپنا سر سجدے سے اٹھا سکی ۔

''ارے راشد بیٹا تم کب آئے..... میں تمہارے لئے کھانا لگاتی ہوں ۔''

افزا بڑی محبت سے راشد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچن کی جانب بڑھ گئی ۔ صبح فجر کے بعد سورۃ رحمان کی تلاوت کرتے ہوئے افزا ایک طویل سجدے کے بعد اپنا سر اٹھا سکی تھی ۔ اس کا ذہن ماضی میں بھٹکنے لگا تھا جب وہ ایک نازک سی ، ہر ایک کا دل موہ لینے والی دوشیزہ تھی ۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ، ماں باپ ، بھائی سب ہی ناز اٹھانے والے ۔

''امی ! جلدی سے کھانا دیں ۔ بہت بھوک لگی ہے ۔'' کالج سے آتے ہی نعرہ لگتا لیکن اکثر کھانے کی میز پر بیٹھنے سے پہلے ہی چپ چاپ کمرے میں جا لیٹتی ۔ امی جا کر سمجھاتیں ۔

''افزا ہر روز تمہاری پسند کا کھانا نہیں ہو سکتا ۔ دوسروں کی پسند کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے ۔ چلو شاباش آؤ اور اللہ کا شکر ادا کر کے کھاؤ کہ اس نے ہمیں بہترین رزق عطا کیا ہے ۔ پر افزا کا موڈ خراب ہو جاتا تو بہت وقت لگا کر ہی درست ہوتا ۔

ابو اپنی پسند سے سب کے لئے سوٹ لاتے تھے ۔ افزا شکریہ کہہ کر کمرے میں آئی لیکن سوٹ کے گہرے پیلے رنگ پر اعتراض کرتے ہوئے اس کو پہننے سے صاف انکار کر دیا ۔ امی نے بہتیرا سمجھایا کہ اتنا خوبصورت کام اور اتنا قیمتی لباس صرف اپنی پسند کا رنگ نہ ہونے پر پہننے سے انکار نہ کرے ، اتنی ناشکری اچھی نہیں ۔ کتنے لوگوں کو تو نئے کپڑے نصیب بھی نہیں ہوتے ۔ پر افزا کئی خوبیوں کی مالک ہونے کے باوجود ان باتوں کو نہیں سمجھتی تھی ۔ رشتہ داروں اور سہیلیوں کی طرف سے دیئے گئے کتنے قیمتی تحائف اس کے معیار کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے ڈبوں میں بند الماری میں پڑے رہتے ۔ کتنے لباس ، سینڈل اور جیولری اپنی قسمت جاگنے کے انتظار میں الماری میں پڑے پڑے اپنی آب و تاب کھو دیتے ۔

تعلیم مکمل ہونے کے بعد کئی رشتے آئے پر افزا کو کوئی نہ کوئی خامی نظر آ جاتی ۔ تائی جان بڑے ارمان سے اپنے قابل بیٹے کا رشتہ لائیں لیکن افزا کو ایمان کا سانولا رنگ اس کی تمام خوبیوں پر حاوی لگا ۔ امی اس کی اس عادت سے بہت خوفزدہ رہتیں اور اس کو ہر وقت شکر کرنے کی

نصیحت کرتی رہتیں۔ابا کا خیال تھا کہ بچپنا ہے اور وقت کے ساتھ افزا ان باتوں کو سمجھ جائے گی۔عمیر کا رشتہ افزا کے لئے نہایت مناسب تھا۔وہ ایک خوبصورت شخصیت کا مالک، پڑھا لکھا سلجھا ہوا انسان تھا۔اس کے گھر والے بھی بہت بردبار اور سمجھدار تھے لیکن افزا کو ان کا غیر معروف علاقے میں چھوٹا سا گھر ایک آنکھ نہ بھایا۔

''دیکھو وہ لوگ بہت امیر نہیں لیکن ان کا کھاتا پیتا شریف گھرانہ ہے۔عمیر بھائی ابھی بہت بڑی پوسٹ پہ نہ سہی لیکن وہ انشاء اللہ اپنی قابلیت سے ضرور زندگی میں بہت آگے بڑھ جائیں گے۔''

اس کی سہیلی نے افزا کو سمجھایا لیکن افزا نے شکر کرنا سیکھا ہی کہاں تھا جو وہ کچھ سمجھتی۔لیکن اس بار اس کے گھر والوں نے اس کی ایک نہ سنی اور افزا بیاہ کر عمیر کے گھر آ گئی۔اس کے سسرال والے بہت محبت کرنے والے قدر دان ثابت ہوئے پر افزا شادی کے کئی سال تک چھوٹے گھر کے غم میں مبتلا رہی۔وقت تیزی سے گزرتا رہا۔عمیر نے اپنی قابلیت سے بہت ترقی کی۔افزا کو کسی چیز کی کمی نہ ہونے دی پر ایک چیز نہ دے سکا جو اس کے بس میں نہ تھی اور وہ تھی اولاد۔شادی کے دس سال بعد بھی افزا کی گود خالی تھی۔

''دیکھو افزا اللہ نے ہمیں دنیا کی ہر نعمت دی ہے۔بے شک اولاد کی کمی بہت بڑی کمی ہے پر اللہ کسی نعمت سے محروم رکھ کر بندے کو آزماتا بھی ہے۔جو کچھ اس نے نوازا ہے اس کا شکر ادا کرو۔گلے شکوے نہ کیا کرو کہ اللہ کو برا لگے۔''

عمیر اکثر اسے سمجھاتا لیکن افزا کی قناعت پسند طبیعت نہ تھی۔شکوے شکایت اس کی زبان پر ہی رہتے۔

''پھوپھو! آج آپ پھر کہیں کھوئی ہوئی ہیں۔'' راشد نے تیسری دفعہ افزا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ارے تم کب آئے مجھے تو خبر ہی نہ ہوئی۔'' افزا آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے بولی۔

''پھوپھو میں تو نہا دھو کر فارغ بھی ہو گیا۔پر مجال ہے جو آپ نے مجھے چائے کا بھی پوچھا ہو۔'' راشد نے محبت سے پھوپھو کو کاندھوں سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

''ارے میرے بچے میں ابھی تمہارے لئے گرم چائے کے ساتھ تمہاری پسند کے کباب بھی لاتی ہوں جو میں نے آج بنائے ہیں۔''

خوشگوار ماحول میں چائے پینے کے بعد افزا اپنے کمرے میں چلی آئی۔ماضی کی تلخ یادیں پھر اس کا پیچھا کرنے لگیں۔

''عمیر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔وہ بچ نہیں سکا۔''

یہ آواز اس کے کانوں میں کیا پڑی کہ وہ اپنے ہوش وحواس سے بے گانہ ہو گئی۔کب میت کو لے جایا گیا۔کب تدفین ہوئی۔اسے کچھ ہوش نہ تھا۔اس کی خود کی زندگی موت سے بھی بدتر ہو چکی تھی۔میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا، شاید میں بہت گناہ گار اور ناشکری بندی ہوں۔زندگی میں شاید پہلی بار اس کو یہ احساس ہوا کہ اس نے زندگی کی نعمتوں کی کوئی خاص قدر نہیں کی۔سب کچھ اپنا حق ہی سمجھا۔ندامت کے آنسو اس کے چہرے کو بھگوتے جاتے۔''یا اللہ! تو مجھے معاف کر دے۔میں تیری بہت خطا کار بندی ہوں۔نعمت کا احساس تب ہی ہوتا ہے جب وہ چھن جائے۔مجھے اپنی رحمت سے دور نہ کرنا میرے گناہوں کی سزا نہ دینا۔'' روتے روتے افزا کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ماضی کی یادیں اور مستقبل کے اندیشے اور وسوسے اسے بے چین کیے ہوئے تھے۔

افزا کو وہ رات بھی اچھی طرح یاد تھی جب نہ جانے کس پہر فون کی گھنٹی بجنے پر اس کا دل انجانے خوف سے دھڑکنے لگا تھا۔اس کا اندیشہ درست نکلا تھا۔چھوٹی بھابھی کی ڈلیوری کے دوران ایک بیٹے کو جنم دے کر دنیا سے رخصت ہونے کی خبر تھی۔ننھے سے وجود کو اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے افزا نے سوچا۔''اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔اس کے ہر کام میں مصلحت ہے۔ایک ننھی سی جان اپنی ماں سے محروم ہو گئی۔''

''آپا!'' چھوٹے بھائی کی آواز پر وہ چونکی۔''آپا! آپ کی بھابھی اب اس دنیا میں نہیں۔میں ان چھوٹے بچوں کی پرورش کے قابل نہیں۔'' بھائی نے تین سالہ ردا اور آٹھ دن کے راشد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے التجا کی۔''آپا، آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہو گا اگر آپ ان ننھی سی جانوں پر اپنا شفقت کا ہاتھ رکھ دیں۔''

آسیہ راشد

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوبِ سبحانی

نبی ﷺ کی ولادت اور بچپن

''اے میرے مالک تو کتنا بڑا کارساز ہے!'' افزا نے کپکپاتے ہاتھوں سے دونوں ننھے وجودوں کو اپنے سینے میں چھپا لیا۔ کس خوبصورتی سے اللہ نے اس کی ممتا کی تسکین اور سر پر چھت مہیا کی تھی جیسے وہ کسی کے احسان تلے نہیں آئی بلکہ اس سے احسان کی بھیک مانگی جا رہی تھی۔ افزا نے تو ان دونوں بچوں کو ماں بن کر پالا ہی لیکن انہوں نے اسے اپنی ماں سے بھی بڑھ کر چاہا اور بھائی نے جو عزت دی، اس کا افزا جتنا شکر ادا کرتی، اتنا کم تھا۔

''اللہ کا کتنا کرم ہے مجھ پر میں گناہ گار بندی اس عزت کے قابل تو نہ تھی'' یہ سوچتے ہوئے افزا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔☆

سرورِ کونین آقائے دو جہاں حضور پاک حضرت محمد ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہؓ کا تعلق مدینے کے قبیلے بنو زہرہ سے تھا، جو کلاب بن مرّہ کی پشت پر جا کر رسولؐ کے ددھیال سے مل جاتا ہے۔ آپؓ کے والد کا نام وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب تھا اور والدہ کا نام برّہ بنت عبدالعزیٰ بن عثمان بن عبدالدار بن قصی تھا۔ مشہور صحابی سعد بن مالک ابی وقاصؓ حضرت آمنہؓ کے چچازاد بھائی تھے جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں آپؐ انہیں اپنے ماموں کہا کرتے تھے۔

آمنہ کے معنی ہیں امن والی یا امن دینے والی۔ انکی پرورش انکے چچا وہیب بن عبد مناف نے کی تھی۔ آپ نسب اور رتبے کے لحاظ سے قریش کی افضل ترین خاتون شمار ہوتی تھیں ان کے والد نسب اور شرف کے لحاظ سے بنو زہرہ کے سردار تھے۔ وہ مکہ میں ہی رخصت ہو کر حضرت عبداللہ کے پاس آئیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نہایت حسین و جمیل خاتون تھیں۔ حضرت عبدالمطلب کے اس بیان سے کہ وہ خوش قسمت ہیں کہ انہیں سفید چہرے والی بہو نصیب ہوئی جس پر وہ خدا کے شکر گزار ہیں سے واضح ہوتا ہے کہ آپؓ کا شمار مکہ کی خوبصورت عورتوں میں ہوتا تھا۔

مکہ کے سردار عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب تھے جن کا سلسلہ نسب حضرت اسمٰعیلؑ سے جا ملتا ہے۔ عبدالمطلب کے دس بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔ سیرت کی کتابوں میں دس بیٹوں کے نام آئے ہیں جو یہ ہیں: حارث، زبیر، ابوطالب، عبداللہ، حمزہ، ابولہب، غیداق، مقوم، صفار اور عباس۔ ان کی چھ بیٹیاں تھیں جن کے نام یہ تھے ام حکیم (بیضاء) برہ، عاتکہ، صفیہ، اروٰی اور امیمہ۔

ان سب میں سے عبداللہ سب سے زیادہ خوبصورت، پاکدامن اور چہیتے تھے اور ذبیح کہلاتے تھے۔ ذبیح کہلانے کی وجہ یہ تھی کہ عبدالمطلب نے خواب دیکھا کہ انہیں زم زم کا کنواں کھودنے کا حکم دیا جا رہا ہے اور خواب میں انہیں اس کی جگہ بھی بتائی گئی۔ انہوں نے بیدار ہونے کے بعد کھدائی شروع کی تو رفتہ رفتہ وہ چیزیں برآمد ہوئیں جو بنو جرائم نے مکہ چھوڑتے ہوئے چاہِ زم زم میں دفن کی تھیں یعنی تلواریں، زرہیں، سونے کے دو ہرن، عبدالمطلب کے ساتھ کھدائی کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ جب زم زم کا کنواں نمودار ہو گیا تو قریش نے عبدالمطلب سے جھگڑا شروع کر دیا کہ ہمیں بھی کھدائی میں شریک کر لو۔ عبدالمطلب نے کہا میں ایسا نہیں کر سکتا، میں اس کام کیلئے مخصوص کیا گیا ہوں۔ لیکن قریش کے لوگ باز نہ آئے یہاں تک کہ فیصلے کیلئے بنو سعد کی ایک کاہنہ عورت کے پاس جانا طے ہوا۔ راستے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی علامات دکھائیں کہ وہ سمجھ گئے کہ زم زم کا کام قدرت کی طرف سے عبدالمطلب کے ساتھ مخصوص ہے۔ اسی لئے وہ واپس چلے گئے۔ عبدالمطلب نے کنویں سے نکلنے والی تلواروں سے کعبہ کا دروازہ ڈھالا۔

سونے کے دونوں ہرن بھی دروازے میں فٹ کئے اور حاجیوں کو زم زم پلانے کا بندوبست کیا۔

یہی موقع تھا جب عبدالمطلب نے نذر مانی کہ اگر اللہ نے انہیں دس لڑکے عطا کئے اور وہ سب اس عمر کو پہنچے کہ ان کا بچاؤ کر سکیں تو وہ ایک لڑکے کو کعبہ کے پاس قربان کر دیں گے۔ ان کی یہ دعا پوری ہوئی اور اللہ نے انہیں دس بیٹے عطا کئے۔ جب سبھی جوان ہو گئے اور اس عمر کو پہنچ گئے کہ ان کا بچاؤ کر سکیں تو عبدالمطلب نے انہیں اپنی نذر سے آگاہ کیا۔ سب نے بات مان لی۔ اس کے بعد قسمت کے تیروں پر ان سب کے نام لکھے گئے اور ہبل کے قیم کے حوالے کر دیا گیا۔

قیم نے تیروں کو گردش دے کر قرعہ نکالا تو عبداللہ کا نام نکلا۔ عبدالمطلب نے عبداللہ کا ہاتھ پکڑا چھری لی اور ذبح کرنے کیلئے خانہ کعبہ کے پاس لے گئے۔ لیکن قریش اور خصوصاً عبداللہ کے ننھیال والے بنو مخزوم اور عبداللہ کے بھائی ابو طالب اور بہنیں آڑے آ گئیں۔ عبدالمطلب نے کہا تب میں اپنی نذر کا کیا کروں۔ انہوں نے کہا وہ کسی خاتون عرافہ (کاہنہ) کے پاس جا کر حل دریافت کریں۔ عبدالمطلب ایک عرافہ کے پاس گئے۔ اس نے کہا عبداللہ اور دس اونٹوں کے درمیان قرعہ اندازی کریں۔ اگر عبداللہ کے نام قرعہ نکلے تو مزید دس اونٹ بڑھا دیں۔ اس طرح اونٹ بڑھاتے جائیں اور قرعہ اندازی کرتے جائیں۔ یہاں تک کہ اللہ راضی ہو جائے پھر اونٹوں کے نام جب قرعہ نکل آئے تو انہیں ذبح کر دیں۔ عبدالمطلب نے واپس آ کر ایسا ہی کیا۔ وہ ہر دس اونٹوں کے بعد قرعہ اندازی کرتے تو قرعہ عبداللہ کے نام ہی نکلتا۔ اس طرح سو اونٹ پورے ہو گئے تو قرعہ اونٹوں کے نام نکلا۔

اب عبدالمطلب نے سو اونٹوں کو عبداللہ کے بدلے ذبح کیا اور انہیں وہیں چھوڑ دیا۔ کسی انسان یا درندے کے لئے ان کا گوشت حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اس واقعے سے پہلے عرب میں خون بہا اور دیت کی مقدار دس اونٹ تھی۔ اس واقعے کے بعد سو اونٹ کر دی گئی۔ اسلام نے بھی اس مقدار کو برقرار رکھا۔ نبیؐ کا ارشاد ہے میں دو ذبیح کی اولاد میں سے ہوں، ایک حضرت اسماعیلؑ اور دوسرے عبداللہ۔

جب اللہ تعالیٰ نے عبداللہ کے بدلے سو اونٹوں کی قربانی قبول کر لی تو ان کی شہرت مکہ کے ہر گھر میں پہنچ گئی۔ اس لئے جب عبدالمطلب نے سیدہ آمنہؓ کے گھر اپنے بیٹے کیلئے رشتہ کا پیغام بھیجا تو وہ فوراً راضی ہو گئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ وہب بن عبد مناف (والد آمنہؓ) وفات پا چکے تھے اور سیدہ آمنہ اپنے بزرگ چچا وہیب کی نگرانی اور کفالت میں تھیں۔ نکاح کے بعد عربوں کے رواج کے مطابق حضرت عبداللہ تین روز تک اپنے سسرال میں رہے اور چوتھے روز دلہن کے ساتھ اپنے گھر آ گئے۔

شادی کے بعد عبداللہ نے اپنا ایک گھر بسا لیا۔ سیدہ آمنہؓ کی خدمت کے لئے ایک حبشی کنیز لائے جس کا نام برکت اور کنیت ام ایمن تھی۔ عبداللہ کے پاس اپنے پانچ اونٹ اور بکریوں کا ایک ریوڑ تھا۔ عبداللہ اور آمنہؓ اپنی ازدواجی زندگی میں بے حد خوش تھے۔

قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام کے لئے روانہ ہوا تو عبداللہ بھی مال تجارت لے کر اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ تجارت قریش کا آبائی پیشہ تھا۔ ان کا خاندان تجارت میں سب سے آگے ہوتا تھا۔ شام سے واپسی کے سفر میں قافلہ یثرب پہنچا تو حضرت عبداللہ کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ ساتھی چند روز تک اُن کی صحت کی بحالی کے انتظار میں وہاں ٹھہرے رہے لیکن انہوں نے کہا تم لوگ جاؤ میں ٹھیک ہو کر آ جاؤں گا۔ قافلہ مکہ روانہ ہو گیا۔ عبداللہ اپنی دادی کے خاندان بنو نجار کے ہاں ٹھہرے۔

جب قافلہ مکہ پہنچا تو عبدالمطلب قافلے میں اپنے بیٹے کو نہ پا کر پریشان ہو گئے۔ قافلے والوں نے عبداللہ کی بیماری کا بتایا تو عبدالمطلب نے اپنے بڑے بیٹے حارث کو یثرب بھیجا تاکہ وہ بھائی کی تیمارداری کرے اور جب وہ صحت یاب ہو جائیں تو انہیں اپنے ساتھ مکہ لے آئے۔ ادھر آمنہؓ کو جب شوہر کی بیماری کا پتہ چلا تو وہ بے چین ہو گئیں۔ وہ ان دنوں حمل سے تھیں۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے آتے اور آنکھیں بھر آتیں۔ عبدالمطلب نے ہر طرح سے ان کا خیال رکھا اور ان

کی دل جوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی کیونکہ وہ ان کے چہیتے بیٹے عبداللہ کی بیوی تھیں۔عبدالمطلب نے اپنی بہو کو عبداللہ کی بیماری کی خبر بہت مشکل سے سنائی اور ساتھ ہی تسلی بھی دی کہ حارث بہت اچھے تیماردار ہیں وہ جلد انہیں تندرست کر دیں گے تم گھبرانا نہیں، میں نے تیروں سے فال نکالی ہے اس کے مطابق عبداللہ جلد صحت یاب ہو کر آ رہے ہیں۔وہ آمنہؓ کو تسلی دے کر چلے گئے مگر آمنہ کے دل کو قرار کہاں تھا۔

ادھر حارث کو بھارئی کی تیمارداری کا موقع ہی نہ مل سکا۔ان کے یثرب پہنچنے سے پہلے ہی عبداللہ اپنی زندگی کا سفر پورا کر چکے تھے۔انہیں نابغۂ جعدی میں سپرد خاک کیا جا چکا تھا۔عبداللہ کی عمر اس وقت پچیس برس تھی۔

حارث بھائی کی بجائے ان کی موت کی خبر اور غم کے ساتھ واپس آئے تو بوڑھے عبدالمطلب کی کمر دکھ کے بوجھ سے دوہری ہوگئی۔جس فرزند کی نذر کی قبولیت پر انہیں نئی زندگی ملی تھی اس کی موت نے ان کی زندگی تلخ بنا دی۔وہ جس بہو کے عطا کرنے پر اللہ کا شکر ادا کرتے تھے وہ جوانی میں ہی بیوہ ہوگئی تھیں۔عبداللہ کے باپ عبدالمطلب، ان کی بیوہ آمنہؓ اور انکے بہن بھائیوں کا غم سارے لوگ مل کر بھی نہ مٹا سکتے تھے۔

چند ماہ کی بیاہی دلہن آمنہؓ کیلئے یہ روح فرسا خبر نا قابل برداشت تھی۔اپنے محبوب شوہر عبداللہ کو یاد کرتیں اور روتیں۔ان کی یاد میں انہوں نے ایک مرثیہ لکھا جو تاریخ کی کتابوں میں رقم ہے۔جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے۔

''بطحا کی آغوش ہاشم کے صاحبزادے سے خالی ہوگئی وہ ایک لحد میں آسودہ ہوگیا۔اسے موت نے ایک پکار لگائی اور اس نے لبیک کہہ دیا۔اب موت نے لوگوں میں ابن ہاشم جیسا کوئی انسان نہیں چھوڑا۔(کتنی حسرت ناک تھی) وہ شام جب لوگ انہیں تخت پر اٹھائے لے جا رہے تھے، اگر موت اور موت کے حوادث نے ان کا وجود ختم کر دیا ہے تو ان کے کردار کے نقوش نہیں مٹائے جا سکتے۔وہ بڑے دانا اور رحم دل تھے۔''

مرثیہ پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت آمنہؓ نہ صرف پڑھی لکھی خاتون تھیں بلکہ عربی زبان کی فصاعت و بلاغت سے بھی بخوبی واقف تھیں انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار کس قدر موثر انداز میں کیا ہے۔

عبداللہ کے اپنی رفیق حیات آمنہؓ اور دوسرے عزیز و اقارب سے معاملات نہایت بہترین تھے۔وہ اپنی اچھی عادات و خصائل، حسن سلوک، ہر ایک سے ہمدردی، دوسروں کیلئے رحیم و کریم ہونے جیسے اوصاف کی وجہ سے اپنے خاندان کے مرد محبوب تھے۔اسی لئے خاندان کے ہر فرد نے ان کی جوان موت کا صدمہ محسوس کیا۔

یہ وہ دور تھا جب عالم دو جہاں میں سرور کونین حضرت محمدؐ کی دنیا میں آمد کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ان کی پیدائش سے پہلے جہاں چاہِ زم زم کی کھدائی والا واقعہ اور عبداللہ کا ذبیح اللہ بن جانا ٹھہرا تھا جس نے شہر مکہ کو تمام عرب ممالک میں مرکز نگاہ بنا دیا تھا، اسی وقت واقعۂ فیل بھی پیش آیا جس سے تمام دنیا کی نگاہیں عرب اور خانۂ کعبہ پر مرکوز ہوگئیں۔

وہ واقعہ یہ تھا کہ ابرہہ صباح حبشی نے جو نجاشی بادشاہ حبش کی طرف سے یمن کا گورنر جنرل تھا، جب دیکھا کہ اہل عرب خانۂ کعبہ کا طواف کرتے ہیں اور یہاں تجارت بھی خوب ہوتی ہے جس سے عرب بہت زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں تو اس نے چاہا کہ وہ اپنے علاقے میں ایسا کعبہ تعمیر کرے تاکہ لوگ اس کی طرف رخ کر لیں اور تجارتی منڈیاں اس کے علاقے میں منتقل ہو جائیں۔سو اس نے صنعا میں ایک بہت بڑا کلیسا تعمیر کروایا تاکہ لوگ وہاں آ کر حج کریں۔جب اس کے ارادے کی خبر بنو کنانہ کو ہوئی تو ان کے ایک آدمی نے رات کے وقت جا کر کلیسا کے اندر گھس کر پاخانہ پوت دیا۔

ابرہہ کو پتہ چلا تو سخت برہم ہوا اور ساٹھ ہزار کا ایک لشکر جرار لے کر کعبے کو ڈھانے کیلئے نکل کھڑا ہوا۔اس نے اپنے لیے ایک زبردست ہاتھی بھی منتخب کیا۔لشکر میں کل نو یا تیرہ ہاتھی تھے۔ابرہہ یمن سے یلغار کرتا ہوا مغمس پہنچا اور وہاں اپنے لشکر کو ترتیب دے کر ہاتھیوں کو تیار کر کے مکے میں داخلے کے لئے چل پڑا۔اس کے لشکر نے آس پاس مکہ والوں کو جو جانور وغیرہ چر چگ رہے تھے سب کو اپنے قبضے میں کیا۔ان جانوروں میں دو سو اونٹ تو صرف عبدالمطلب کے ہی تھے اب ابرہہ نے

اپنا قاصد حناط حمیری مکہ والوں کے پاس بھیجا کہ مکہ کے سب سے بڑے سردار کو میرے پاس لاؤ اور یہ بھی اعلان کر دو کہ میں لڑنے نہیں آیا، میرا ارادہ تو صرف بیت اللہ کو گرانے کا ہے۔ ہاں اگر مکہ والے اسے گرانے کے درپے ہوئے تو لامحالہ مجھے ان سے لڑائی لڑنی پڑے گی۔

حناط مکہ کے سردار عبدالمطلب کو ساتھ لے کر بادشاہ کے پاس آیا، بادشاہ نے جب انہیں دیکھا تو ہیبت میں آ گیا۔ عبدالمطلب گورے چٹے سڈول اور مضبوط قویٰ والے حسین وجمیل انسان تھے۔ دیکھتے ہی ابرھہ تخت سے نیچے اتر آیا اور فرش پر عبدالمطلب کے ساتھ بیٹھ گیا اور ترجمان سے کہا ان سے پوچھ یہ کیا چاہتا ہے؟ عبدالمطلب نے کہا میرے دوسو اونٹ جو بادشاہ نے لے لیے ہیں انہیں واپس کر دیا جائے۔ بادشاہ نے کہا ان سے کہہ دے کہ پہلی نظر میں تیرا رعب مجھ پر پڑا تھا اور میرے دل میں تیری وقعت بیٹھ گئی تھی لیکن پہلے ہی کلام میں تو نے وہ سب کھو دی، اپنے دوسو اونٹوں کی تو تجھے فکر ہے اور اپنی اور اپنی قوم کی تجھے فکر نہیں۔ میں تو تم لوگوں کا عبادت خانہ توڑنے اور اسے خاک میں ملانے کیلئے آیا ہوں۔

عبدالمطلبؓ نے جواب دیا، سن بادشاہ اونٹ تو میرے ہیں اس لئے انہیں بچانے کی کوشش میں ہوں اور خانہ کعبہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے وہ خود اسے بچائے گا۔ اس پر یہ سرکش کہنے لگا، خدا بھی آج اسے میرے ہاتھ سے نہیں بچا سکتا۔ عبدالمطلب نے کہا بہتر ہے وہ جانے اور تو جانے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اہل مکہ نے تمام حجاز کا تہائی مال ابرھہ کو دینا چاہا کہ وہ اپنے اس بدارادے سے باز آئے لیکن اس نے قبول نہ کیا۔

خیر، عبدالمطلب تو اپنے اونٹ لے کر چل دیئے اور آ کر قریش کو حکم دیا کہ مکہ بالکل خالی کر دو اور پہاڑوں میں چلے جاؤ اب عبدالمطلب اپنے ساتھ قریش کے چیدہ چیدہ لوگوں کو لے کر بیت اللہ میں آئے اور بیت اللہ کے دروازے کا کنڈا تھام کر اور رو رو کر اور گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگنی شروع کیں کہ باری تعالیٰ ابرھہ اور اسکے خونخوار لشکر سے اپنے پاک اور ذی عزت گھر کو بچا لے۔ انہوں نے یہ دعائیہ اشعار پڑھے۔

''ہم بے فکر ہیں، ہم جانتے ہیں کہ ہر گھر والا اپنے گھر کا بچاؤ آپ کرتا ہے اے اللہ تو بھی اپنے گھر کو اپنے دشمنوں سے بچا۔ یہ تو ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ان کی صلیب اور ان کی ڈولیں تیری ڈولوں پر غالب آجائیں۔''

اب عبدالمطلب نے بیت اللہ کے دروازے کا کنڈا ہاتھ سے چھوڑ دیا اور اپنے تمام ساتھیوں کو لے کر آس پاس کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ گئے اور جاتے ہوئے قربانی کے سو اونٹ بیت اللہ کے اردگرد نشان لگا کر چھوڑ دیئے، اس نیت سے کہ اگر یہ بددین آئے اور انہوں نے اللہ کے نام پر قربانی کے ان جانوروں کو چھیڑا تو عذاب اللہ ان پر اترے گا۔

دوسری صبح ابرھہ کا لشکر مکّہ جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ ابرھہ نے اپنے خاص ہاتھی ''محمود'' کو تیار کیا جو بہت زور آور ہاتھی تھا۔ ابرھہ کے ساتھ نفیل بن حبیب تھا۔ یہ مکہ کا باشندہ تھا جو مکہ آتے ہوئے راستے میں اس سے لڑا تھا اور ابرھہ نے اسے قیدی بنا کر ساتھ رکھ لیا تھا تاکہ راستے کی نشاندھی کر سکے۔ نفیل نے شاہی ہاتھی کا کان پکڑ لیا اور کہاں محمود بیٹھ جا اور جہاں سے آیا ہے وہیں خیریت کے ساتھ چلا جا تو اللہ تعالیٰ کے محترم شہر میں ہے۔ یہ کہہ کر کان چھوڑ دیا اور قریب کی پہاڑی میں جا چھپا۔ یہ سنتے ہی ہاتھی بیٹھ گیا اور کعبہ کی طرف بڑھنے کے لئے کسی صورت نہ اٹھا اس کا رخ شمال جنوب یا مشرق کی طرف کیا جاتا تو اُٹھ کر بھاگنے لگتا لیکن کعبہ کی طرف کیا جاتا تو بیٹھ جاتا۔

اسی دوران اللہ نے چڑیوں کا ایک جھنڈ بھیج دیا۔ لوگوں نے دیکھا ایک گھٹا ٹوپ پرندوں کا جھرمٹ بادل کی طرح سمندر کے کنارے کی طرف سے امڈا چلا آ رہا ہے۔ ابھی پوری طرح دیکھنے بھی نہیں پائے تھے کہ وہ پرندے سر پر آ گئے اور سارے لشکر کو گھیر لیا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں ان پرندوں کی چونچ تھی اور پنجے کتوں جیسے تھے حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں یہ سبز رنگ کے پرندے تھے جو سمندر سے نکلے تھے ان کے سر درندوں جیسے تھے۔

یہ پرندے باقاعدہ لشکریوں کی طرح پرے باندھ کر کھڑے ہو

گئے اور چیخنے لگے ۔ پھر پتھراؤ کیا، ہر ایک پرندے کی چونچ میں مسور یا ماش کے دانے کے برابر کنکری تھی اور دونوں پنجوں میں دو کنکریاں تھیں ۔ جس جس پر کنکری آ پڑتی وہ وہیں ڈھیر ہو جاتا۔ جس کے جس عضو پر پڑتا وہ عضو وہیں ساقط ہو جاتا۔ ساتھ ہی تیز آندھی آئی جس سے آس پاس کے کنکر بھی آنکھوں میں گھس گئے اور سب کچھ تہ و بالا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تہس نہس کر دیا، ہر خاص و عام کو ہلاک کر دیا بھاگتے بھاگتے ان کے اعضاء کٹ کٹ کر گرتے جاتے اور بالآخر جان سے جاتے ۔ بادشاہ بھی بھاگا ایک ایک عضو بدن جھڑنا شروع ہوا جب تک وہ صنعاء شہر میں پہنچا تو بالکل گوشت کا لوتھڑا بنا ہوا تھا وہیں بلک بلک کر دم توڑا، کتے کی موت مرا۔

یہ واقعہ ایسے حالات میں پیش آیا کہ اس کی خبر متمدن دنیا کے بیشتر علاقوں روم و فارس میں آناً فاناً پھیل گئی۔ اس واقعے کی وجہ سے متمدن دنیا کی نگاہیں خانہ کعبہ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ انہیں بیت اللہ کے شرف و عظمت کا ایک کھلا ہوا خدائی نشان نظر آ گیا اور یہ بات دلوں میں اچھی طرح بیٹھ گئی کہ اس گھر کو اللہ نے تقدیس کیلئے منتخب کیا ہے لہٰذا یہاں کی آبادی سے کسی انسان کا دعویٰ نبوت اس واقعے کے تقاضے کے عین مطابق ہوگا اور اس خدائی حکمت کی تفسیر ہوگا۔

یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی پیدائش مبارک سے پچاس پچپن دن پہلے پیش آیا ۔ دنیا میں حضورؐ کی آمد کی تیاری کی جا رہی تھی اور پھر ننھے حضور ﷺ مکہ مکرمہ میں شعب بن ہاشم کے اندر 12 ربیع الاول (بعض روایات میں ہے 9 ربیع الاول) عام الفیل یوم دوشنبہ بعد از صبح صادق بروز پیر موسم بہار کے ایک خوشگوار دن پیدا ہوئے اور یہ 22 اپریل 571ء کی تاریخ تھی۔ بکرمی کیلنڈر کے مطابق یکم جیٹھ 628 بنتا ہے۔

آپؐ کی پیدائش کے فوراً بعد عبداللہ کی لونڈی برکہ نے آپؐ کے دادا عبدالمطلب کو خانہ کعبہ میں جا کر اطلاع دی۔ سیدہ آمنہؓ نے بتایا کہ جب بچے کی ولادت ہوئی اس وقت میرے جسم سے ایک نور نکلا جس سے ملک شام کے محل روشن ہو گئے۔

بعض روایات میں ہے کہ ولادت کے وقت بعض واقعات نبوت کے پیش خیمے کے طور پر ظہور پذیر ہوئے یعنی ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے، مجوس کا آتش کدہ ٹھنڈا ہو گیا بحیرہ ساوہ خشک ہو گیا، اس کے گرجے منہدم ہو گئے۔

(جاری ہے)

استفادہ: سیرت ابن ہشام، الامین محمد رفیق ڈوگر، رحیق المختوم از مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری، سیرت النبی از علامہ شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی۔ ننھے حضورؐ احسان بی اے

☆.....☆.....☆

نیویارک میں چند روز

نیویارک میں نووارد ہوئے تیسرا دن تھا۔

دوپہر تک سورج چمک رہا تھا مگر شام ساڑھے پانچ بجے جب میں یو این بلڈنگ سے نکلی تو کن من شروع ہو چکی تھی۔آج میں نے بلڈنگ میں گھومتے گھامتے نجانے کون سا غیر مقبول ایگزٹ لیا تھا کہ عمارت کے بالکل اجنبی صحن میں جا نکلی تھی۔راہداری سے دریا تک سوکھے بھورے درختوں کا جنگل سا تھا اور روشوں پر تہہ در تہہ سوکھے پتوں کا انبار۔ہلکی بارش میں بھیگا ہوا مجھے پہلی بار نیویارک کا کوئی نظارہ بھلا لگا۔میں بے اختیار رک گئی،کیمرہ نکالا اور چند تصویریں بنائیں۔

یکا یک احساس ہوا کہ یہ ناگہانی بارش بڑھتی جا رہی ہے اور میرے پاس نہ چھتری ہے نہ رین کوٹ۔باہر نکلنے کا راستہ بھی دیکھا بھالا نہیں۔ایک غلط موڑ مجھے پورا بھگو سکتا ہے۔صحن بالکل خالی تھا،بس میرے آگے ایک شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا جا رہا تھا جو چند لمحے پہلے اِسی ایگزٹ سے نکلا تھا۔میرے پاس واحد رستہ اس کا پیچھا کرنا رہ گیا تھا۔یہ فیصلہ سودمند ثابت ہوا کیونکہ کچھ ہی دیر میں اس کے نقشِ قدم مجھے مین گیٹ تک لے آئے۔چند لمحے سیکیورٹی لاؤنج میں کھڑے ہو کر سانس درست کیا اور اگلے معرکے کے لیے سڑک پر قدم رکھ دیئے۔

بارش ہر لمحہ بڑھ رہی تھی۔اب مجھے صورتحال کی سنگینی کا پورا احساس ہونے لگا کیونکہ میں ابھی تک سٹیشن کا راستہ بھٹکے بغیر نہیں ڈھونڈ سکتی تھی ،جبکہ آج بارش کے باعث میرے پاس آوارہ گردی کی مہلت نہ تھی،کھونے اور پانے کی عیاشی آج نہیں ہو سکتی تھی،شام گہری ہو رہی تھی اور مجھے کم سے کم وقت میں ٹرین سٹیشن کا درست داخلہ ڈھونڈ کر اس میں گھسنا تھا۔

میں نے بے بسی سے اردگرد کا جائزہ لیا۔خلافِ معمول بہت کم بلکہ اکا دکا لوگ تھے۔یکا یک سڑک کے پار نظر پڑی تو سامنے وہی شخص تھا جس کے پیچھے چل کر میں نے گیٹ کا راستہ دریافت کیا تھا،اسی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا، گلے میں بیگ لٹکائے کالے کوٹ میں ڈاکٹر واٹسن ٹائپ کردار۔اس بار فیصلہ کرنے کے لیے کم سوچنا پڑا کیونکہ اب مشترک حوالے ایک سے زیادہ ہو گئے تھے۔کسی اجنبی رہگیر کی بجائے اس آشنا اجنبی سے مدد لینا زیادہ بہتر تھا کہ اگر ڈیلی گیٹ نہ بھی ہوا تو یو این کا ملازم ہوگا۔تیز قدم ہو کر میں نے اس کی منزل پوچھی اور سٹیشن کا سن کر اطمینان کا سانس لیا۔نیویارک کا یہ رہائشی واقعی یو این بلڈنگ میں کسی ذمہ داری پر مامور تھا۔اب میں نے سوچنا بند کر دیا اور اللہ کے بعد اس لمبے امریکی پر بھروسہ کیا جس کے ساتھ تقریباً بھاگتے ہوئے اب میرا سانس پھول رہا تھا۔گرینڈ سنٹرل سٹیشن بہت بڑا ہے اور اندر ہی اندر کئی بلاکس پر پھیلا ہوا ہے۔سٹیشن میں داخل ہو کر ان زیرِ زمین بھول بھلیوں میں اس نے خاصی دور تک چل کر مجھے میرے پلیٹ فارم تک پہنچایا اور اپنی راہ لی۔

یہاں کے لوگ مدد کرتے ہیں۔ آنے سے پہلے یہ سنا تھا اور اس کو درست پایا۔ ایک تو کثیر القومی شہر ہونے کی بنا پر غیر ملکی شکل وصورت کوئی اچنبھا نہیں۔ دوسرے سیاحوں کی کثرت کے باعث ہر کوئی جانتا ہے کہ نیا آنے والا کس قسم کے مسائل سے دوچار ہوگا۔ یہاں کے گداگر بھی سیاحوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔ ٹائم سکوئر سٹیشن پر اکثر نوجوان لڑکوں کا کوئی گروپ میوزک کے ساتھ اچھل کود کر رہا ہوتا اور آخر میں سکوں کے لیے ٹوپی پھیلا دیتا۔ ہمیں تو ہٹے کٹے فقیر کو دیکھ کر شرم دلانے کی عادت ہے کہ کوئی کام کیوں نہیں کرتے۔ ان کو ہم کیا کہتے جو بے چارے چند سکوں کی بھیک بھی دہاڑی دار مزدور سے زیادہ محنت کر کے مانگتے تھے ،گویا بھیک بھی ''کماتے'' تھے۔

ریفیو ہیاڈو

کانفرنس کے دوران مووی سکریننگ کے بھی سیشن تھے جن کے بعد مووی پر اظہارِ خیال اور فلم ڈائریکٹر سے سوال و جواب کا سلسلہ ہوتا۔ ایک مووی ''ریفیو ہیاڈو'' (پناہ گزین) کا بطورِ خاص ذکر کرنا چاہوں گی۔ سچے واقعات سے اخذ کی ہوئی ہسپانوی زبان کی اس فلم کی کہانی عورتوں پر گھریلو تشدد اور بچوں پر اس کے اثرات کے موضوع پر تھی۔ موضوع کی سفاکی کے باوجود ایک بھی پُر تشدد منظر نہیں تھا۔ واقعات اور احساسات کی سطح پر اس خوبی سے فلم تخلیق کی گئی تھی کہ اختتام پر اکثر ناظرین آنکھوں کے نم گوشے صاف کر رہے تھے۔ جس نفاست اور احتیاط سے اس نازک موضوع کو ٹریٹ کیا گیا وہ قابلِ داد تھا۔ اگرچہ فلمسازی دنیا بھر میں ایک صنعت ہے جس کا مقصد پیسہ کمانا ہے، مگر اپنے معاشرتی مسائل پر پوری گرفت اور پھر پیش کاری میں ذہانت کا استعمال مغرب میں معیاری فلموں کی تخلیق کی بنیادی وجہ ہے۔ یہ فلمیں کاروبار بھی اچھا کر جاتی ہیں کیونکہ ان کا ناظر بھی باشعور ہے، ہمارے فلم بینوں کی طرح بالی وُڈ کی بارہ مسالے کی چاٹ کا شیدائی نہیں۔

شوقِ تماشا

کیفے کے ساتھ یو این سوونیئرز کے کئی سٹال تھے۔ ایک سٹال پر ایک کم عمر شوخ سی امریکی لڑکی کھڑی تھی۔ خریداری کرتے ہوئے یونہی اس سے پوچھا کہ گھومنے کے لیے کوئی جگہ بتاؤ۔ چند مشہور جگہوں کا ذکر کر کے کہنے لگی، لیکن اگر واقعی مزا کرنا ہے.....ہپ ہوپ یونو.....آئی مین ریئل فن.....اس کی آنکھیں خاص انداز سے چمکنے لگیں۔ اب وہ مجھے بڑے خلوص کے ساتھ بروڈوے پر کسی 'بہت خاص' جگہ کا پتہ دے رہی تھی اور میں اپنی مسکراہٹ چھپانے میں ناکام ہو رہی تھی۔

مین ہیٹن کی ان سایہ دار گلیوں میں شاید ہی کوئی گلی ہو، جس میں کوئی مشہور و معروف جگہ موجود نہ ہو یا جس کے مناظر ہالی ووڈ موویز کی زینت نہ بنے ہوں۔ آپ غلطی سے بھی کسی طرف نکل جائیں تو کوئی نہ کوئی ایسی جگہ سامنے آجاتی ہے جس کے بارے میں دیکھ سن یا پڑھ رکھا ہوتا ہے۔ بزبانِ ولی:

ہر پیچ میں چیرے کے ترے لپٹے ہیں عاشق
عالم کے دلاں بند ہیں تجھ بند قبا کے

لہذا نیویارک دیکھنے کے شوق کو بہت سی لگامیں ڈال کر رکھنا ضروری تھا۔ ہم خود ہی ایک جگہ کو منتخب کرتے، اسے دیکھنے اور نہ دیکھنے کے سارے دلائل دونوں طرف سے خود ہی پیش کرتے اور پھر فیصلہ سنا دیتے جو عموماً نہ دیکھنے کے حق میں ہوتا۔ مثلاً مجسمہ آزادی.....وہ تو دور بہت ہے، فیری پر بیٹھو پھر واپس آؤ، پورا دن لگ جائے گا۔ سنٹرل پارک.....وہ تو آپ کبھی بھی پورا نہیں پھر سکتے اتنا بڑا ہے، تو پھر ایک کونہ جھانک لینے کا فائدہ.....مادام تساؤ.....لندن والا ہوتا تو بات بھی تھی، یہ تو یونہی سا ہوگا.....میوزیم آف نیچرل ہسٹری.....سنا ہے امریکیوں کی نیچرل ہسٹری ہے، دنیا کی ہوتی تو دیکھ لیتے..... میسیز سٹور.....شاپنگ والا تو یہاں کوئی حال ہی نہیں اور پھر ہر چیز تو ہمارے ہاں ملتی ہے.....ٹائم سکوئر.....روزانہ راستے میں پڑتا ہے، کسی دن رک کر گھوم لیں گے۔ مشہور اوپیرا ہاؤس لنکن سنٹر.....ایک دن رستہ بھٹکی تھی تو خود ہی سامنے آ گیا تھا، بس سرسری سا دیکھ لیا کافی ہے۔ صاحب کی پرزور فرمائش تھی کہ امپائر سٹیٹ ضرور جاؤ۔ ہم نے کہا

اچھی بلڈنگ ہے، تصویروں میں زیادہ اچھی طرح دِکھ جاتی ہے۔ بولے حد ہوگئی، آپ کو بلڈنگ نہیں دیکھنی بلکہ اس کی چھت پر سے شہر کا نظارہ کرنا ہے جو کہ ایک انوکھا تجربہ ہوتا ہے.....آخر اتنی اونچی بنائی ہے انہوں نے وہ بلڈنگ.....اور پھر شہر بھی نیویارک جیسا.....

اب ہم نے پوری سنجیدگی سے دل کو لائن حاضر کیا کیونکہ ہمارے قیام کا واحد ویک اینڈ آن پہنچا تھا اور کانفرنس میں دو دن کا وقفہ تھا۔ فیصلے پر نہ پہنچ سکنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ دو دن بالکل ضائع ہو جائیں گے۔ دل نے پورے خلوص سے تین جگہوں کا نام لیا ..... وال سٹریٹ، گراؤنڈ زیرو اور گرین وِچ ویلج.....جب معلوم ہوا کہ پہلی دونوں جگہیں پاس پاس بھی ہیں اور یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہیں تو خواہش ارادے میں ڈھلنے لگی۔ ندا سے پوچھا تو کہنے لگی، مجھے آج ایک کام سے اسی طرف جانا ہے، اچھا ہے میں بھی دیکھ لوں گی، پھر اس کے بعد آپ اپنا پروگرام خود بنا لیجئے گا۔ اتورکا دن گرین وچ کے لیے سوچ لیا کیونکہ وہ زیادہ فاصلے پر تھا۔

وال سٹریٹ

مشتاق ہیں عشاق تری بانکی ادا کے
زخمی ہیں محباں تری شمشیرِ جفا کے

سرمایہ دارانہ نظام کا یہ قبلہ و کعبہ شاید اس وقت ہماری دنیا کی طاقتور ترین جگہ ہے۔ عالمی منڈی میں سب سے زیادہ کاروبار کی حامل دو بڑی سٹاک ایکسچینج کی کمپنیاں جو اتفاق سے دونوں امریکی ہیں، ان کے مراکز یہاں پر ہیں۔ کچھ سال قبل یہاں ہونے والے مظاہروں نے دنیا میں ان کو بہت خوش کیا جو سودی معیشت کے شکنجوں میں جکڑے، عالمی مالیاتی اداروں کے زہر میں پور پور ڈوب کر نیم جان ہو رہے تھے۔ یا جو کارل مارکس مرحوم کی پیشین گوئیوں کے سچا ہونے کی امید میں اب تک زندہ تھے۔ مگر کیپیٹل ازم کی بنیادیں ہلنا تو کجا، اس کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ اپنی سیاسی پالیسیوں کی بنا پر دنیا بھر کی نفرت مول لینے والے امریکہ کی سرزمین پر جو اترتا ہے، اس کے منہ کو ڈالروں کا خون لگنے کی دیر ہوتی ہے کہ وہ اپنا رام بھول کر اس کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیتا ہے۔

کیا ہوں رفتہ رفتہ رام اس کی چشمِ وحشی کوں
کہ جیوں آہو کو کرتے ہیں شکار آہستہ آہستہ

اس نظام کا پہلا جھٹکا تو ہمیں جان ایف کینیڈی ایرپورٹ پر اترتے ہی ملا تھا، جب سامان کے لیے حسبِ معمول ٹرالی گھسیٹنا چاہی تو ایک پلا ہوا گارڈ سامنے آ گیا اور گھور کر کہنے لگا ''سسکس ڈالرز''۔ پہلے تو ہمیں اپنے کانوں پر یقین نہ آیا، پھر زیرِ لب کہا ''ندیدے!'' اور ادائیگی کر دی۔

بعد میں قدم قدم پر اندازہ ہوتا رہا کہ یہاں ہر طرف ڈالر ڈالر کھیلا جاتا ہے۔ یورپ کی طرح ویلفیئر سٹیٹ کا تصور لے کر کوئی یہاں آئے تو اسے وافر مقاماتِ حیرت و حسرت ملیں گے۔ علامہ اقبال انٹرنیشنل پر انتظار کے دوران ہم ایگزیکٹو لاؤنج کی تمام سہولیات سمیت آن لائن سروس سے مستفید ہوتے رہے تھے۔ دو حہ ایرپورٹ پر لمبی لمبی سکائپ کالیں کر کے بچوں کو ایرپورٹ کے دلچسپ نظارے دکھائے تھے۔ یہاں پر جب باوجود کوشش کے رابطے کی مردہ رگوں میں جان نہ آئی تو ایک کاؤنٹر پر جا کر پوچھا، یہاں آن لائن سروس نہیں ہے؟ جواب ملا، آپ کو پے کرنا ہوگا، اور ہم لاحول پڑھ کر رہ گئے۔ یہ اس کیپٹلسٹ معیشت ہی کی برکات ہیں کہ میرے بچوں نے مجھے رخصت کرتے ہوئے بڑوں کی طرح نصیحت کی کہ باسکن اینڈ رَوبن کی آئس کریم اور سٹاربکس کی کافی ضرور ٹرائے کرنی ہے.....مبادا کفرانِ نعمت ہو جائے!

پاپیادہ حاضری

مسلسل کن من ہو رہی تھی۔ وال سٹریٹ ٹریفک کے لیے بند تھی۔ لوگ پیدل گھوم رہے تھے۔ سو ہم نے بھی اس کوئے ملامت پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک پاپیادہ سفر کیا۔ اشفاق احمد مرحوم کا ٹیلی پلے ''ننگے پاؤں'' یاد آتا رہا۔ نیویارک اسٹاک ایکسچینج کی عمارت کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر اپنی کم مائیگی کا اعتراف کیا اور قصوروں کی معافی چاہی، ٹاؤن ہال کے سامنے نصب جارج واشنگٹن کے مجسمے کو خراجِ عقیدت پیش کیا، عمارتوں کی بلند پیشانیوں پر کندہ ڈیڑھ سے دو سو سال

پرانی تاریخیں پڑھ کر سر دُھنا، اور جب فدویت میں پور پور ڈوب گئے تو دیکھا کہ وال سٹریٹ ختم ہے اور سامنے ٹرینٹی چرچ کھڑا ہے۔ بائیں مڑ جائیں تو آگے باؤلنگ گرین پبلک پارک کے قریب کانسی کا بنا ہؤا وہ مشہور غصیلے بھینسے کا مجسمہ نصب ہے جو اس سرمایہ داری نظام کی طاقت کی علامت بن گیا ہے۔ OWS مظاہروں کے دوران اس بھینسے کی بھی میڈیا میں خوب ''کردار کشی'' ہوئی۔

ٹرینٹی چرچ کی ڈیوڑھی میں ملکہ برطانیہ الزبتھ دوم کے نقشِ قدم پر سنہرا دائرہ لگایا گیا ہے۔ ۱۶۹۶ میں قائم ہونے والے اس چرچ کی ۱۷۸۸ میں تعمیرِ نو ہوئی جبکہ موجودہ عمارت ۱۸۴۶ کی بنی ہوئی ہے۔ ٹوئن ٹاورز گرنے کا سانحہ پیش آیا تو بہت سے لوگوں نے گرتے ہوئے ملبے سے بچنے کے لیے اس چرچ میں پناہ لی۔ مین ہیٹن کا سب سے پرانا چرچ سینٹ پال چیپل اسی کا حصہ ہے اور اس سے کچھ ہی بلاکس کے فاصلے پر ہے۔ اس کے صحن میں لگا ہؤا سو سال قدیم انجیر کا درخت بھی اس حادثے میں تباہ ہؤا۔ اب اس کی جڑوں پر یادگاری مجسمہ نصب ہے۔

چرچ کا اندرونی منظر بے حد خوبصورت ہے۔ اونچے اونچے ستون کمان دار قوسوں کی شکل میں بلند چھت سے جا ملتے ہیں۔ رنگین شیشوں کی ٹکڑیوں کے پیچیدہ ڈیزائن سے بنی ہوئی کھڑکیاں اور چرچ کے ماحول کا مخصوص الوہی تقدس۔ تصورات میں سنے اور پڑھے ہوئے کئی مناظر تخیل کی رنگ آمیزی کے ساتھ گھومتے رہے۔

گراؤنڈ زیرو

کسی زبردست ایکشن تھرلر مووی کے ہوش ربا مناظر کی طرح ٹوئن ٹاورز سے یکے بعد دیگرے دو جہازوں کا ٹکرانا اور چند لمحوں بعد ان دیوقامت میناروں کا دیمک زدہ ڈھانچے کی طرح زمیں بوس ہو کر دھول کے سمندر میں غرق ہو جانا..... اس وقت یہ تباہی کتنی بڑی محسوس ہوئی تھی۔ مگر کیا خبر تھی کہ یہ تو صرف کرہِ ارض پر تباہیوں کے ایک لامتناہی سلسلے کا نقطۂ آغاز ہے، اور اس کے بعد اسی ہالی وُڈ سٹائل سے نہ صرف عراق اور افغانستان اُدھیڑ کر رکھ دیے جائیں گے بلکہ پاکستانیوں کی زندگیاں بھی اجیرن ہو جائیں گی، اور Embedded جرنلزم نامی ہنر کے طفیل دنیا کو خبر بھی نہ ہوگی کہ کیا کچھ ہو چکا ہے!!

ٹوئن ٹاورز کی وسیع و عریض جگہ کو اسی طرح رکھ کر دونوں میناروں کی بنیادوں پر دو وسیع تالاب بنائے گئے ہیں جن میں ہر وقت ماربل کے بنے کناروں سے پھسل کر پانی گرتا رہتا ہے۔ ایک تو بارش اوپر سے یہ مسلسل بہتا پانی..... یوں لگا دنیا پانی کی بنی ہے۔ سانحے میں جاں بحق ہونے والوں کے نام اعلیٰ درجے کے گرینائٹ پر بڑی خوبصورتی اور صفائی سے کندہ کیے ہوئے ہیں جن میں بہت سے مسلمان نام بھی شامل ہیں۔ ان ٹاورز کا غم غلط کرنے کے لیے پاس ہی ایک نیا ٹاور کھڑا کر دیا گیا ہے، مرحومین میناروں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور قیمتی، امپائر سٹیٹ سے بھی اکیس فٹ اونچا، جس سے پرانے ٹاوروں کی نسبت کہیں زیادہ بزنس ملنے کی توقع کی جا رہی ہے۔ ایک عالیشان میوزیم بھی بنایا گیا ہے جس کو ایک ماہ پہلے ہی کھولا گیا تھا اور جس پر ٹکٹ لینے والوں کی لمبی قطاریں تھیں، اور جس میں اس حادثے کی باقیات کو سیاحوں کے ہاتھ مہنگے داموں بیچا بھی جاتا ہے۔

اس کے بعد جب ہم نے ایک شیڈ کے نیچے اس یادگار کے لیے صدقہ دینے کو ڈبہ رکھا ہؤا دیکھا تو اس ''فاقہ مستی'' پر بل کھا کر رہ گئے۔ ایک نفسیاتی حربے کے علاوہ اور اس کا کوئی مقصد سمجھ نہ آیا۔ ہم اس کے سوا کیا کہتے کہ صاحب! ہم سے زیادہ کس نے تاوان بھرا ہے آپ کے نقصان کا..... ہم نے تو مال کیا، اپنی خود مختاری گروی رکھ دی..... جانیں صدقہ کر دیں..... اب آپ اور کیا مانگتے ہیں ہم سے!!

یہ اسی واقعے سے شروع ہونے والے حالات کا شاخسانہ ہے کہ سالہا سال سے مغربی ممالک کی ترقی میں اپنا خون پسینہ بہانے والی مسلمان آبادیوں کو امتیازی رویوں اور ہیٹ کرائمز کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ نو گیارہ تبدیلی کے جس سلسلے کا آغاز ثابت ہؤا، اس کا سب سے بڑا حصہ بیانیوں (Narratives) کی تبدیلی ہے۔ عالمگیریت نامی نئی بلا نے اب ہماری زندگی کے ہر پہلو کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ کیا ورلڈ آرڈر

اور کیا دہشت گردی کے خلاف قوانین، امریکہ بہادر کی تھانیداری کو سب سے زیادہ فائدہ اسی بلا نے دیا ہے۔ اور اس سارے کھیل کی کامیابی کے لیے پرانے بیانیے یکسر تبدیل کر دینا بے حد ضروری تھا۔ مسلمان کے امیج کو دہشت گردی سے جوڑنا اسی کا حصہ ہے۔ امریکہ تو امریکہ، برطانیہ میں گزشتہ سال مسلمانوں کے خلاف ۵۷۰ ہیٹ کرائمز رپورٹ ہوئے جن میں زیادہ تر کا نشانہ مسلم خواتین بنیں (۵)۔ واشنگٹن پوسٹ کے مطابق اس واقعے نے امریکی مسلمانوں کے لیے حالات کو یکسر تبدیل کر دیا ہے (۶)۔

ٹائم سکوئر

ٹائم سکوئر نیویارک کی اصل رونق ہے۔ شام پڑتے ہی بڑی بڑی سکرینیں جگمگانے لگتی ہیں۔ یہ اور بات کہ یہاں بل بورڈز صرف ٹائم سکوئر کے علاقے میں نظر آئے۔ ہماری طرح نہیں کہ ڈرائیور کی توجہ بٹانے کے لیے شہر کے ہر چوراہے پر کہیں کرینہ کپور لیٹی ہے تو کہیں ایان علی۔ سیاحوں کے غول کے غول پھرتے ہیں، کیفے اور دکانیں ہر وقت آباد رہتی ہیں۔

ایک سکرین کے نیچے خوب گہما گہمی تھی۔ دیکھا تو اس پر تماش بینوں کا اپنا تماشا لگا ہوا تھا۔ پسِ پردہ کہیں چھپا ہوا تماشا گر لوگوں کے ہجوم پر کیمرہ فکس کر دیتا، سکرین پر دل کا خاکہ ابھرتا اور دل کے ماروں کو بوسہ کشی کی دعوت دی جاتی۔ پھر وہ دل سمٹتا سمٹتا عین درمیان میں اس طرح رک جاتا کہ صرف ایک بوسہ کش جوڑے کو اپنے حلقے میں لے لیتا اور سارا ہجوم سیٹیوں اور تالیوں سے داد دیتا۔

سارا دن پیدل چلتے اب میرا تھکن اور پیاس سے برا حال تھا۔ مشروبات کی ایک دکان میں جھانکا تو وہاں بادہ و ساغر والا معاملہ لگا۔ تھوڑا آگے ایک کیفے تھا۔ سٹاربکس کولڈ کافی کے نام پر جو چیز ملی اس میں چند گھونٹ پانی ملی کافی کے تھے اور باقی گلاس برف سے بھرا ہوا تھا۔ ایک پتلا سویٹر پہن کر دن بھر بارش میں بھیگنے، اور واپسی کا سارا راستہ برف چبانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اپارٹمنٹ پہنچتے ہی بخار ہو گیا، سینہ ٹھنڈ سے جکڑا گیا اور میں بے جان ہو کر یوں بستر پر گری کہ اگلے دن گھومنے کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

جو کُوئے یار سے نکلے تو.....

ہمارے بچپن میں عام آدمی کیلئے ہوائی جہاز کا سفر محض ایک خواب تھا ۔ جہاز بھی تعداد میں کم ہوتے تھے اور مسافر بھی ۔ جب کبھی کوئی دوسرے ملک کا سفر کر کے واپس آتا تو خاندان کے لوگ اکٹھے ہو کر اس کی سرگذشت گم صم بیٹھ کر یوں سنا کرتے ، جیسے طلسم ہوشربا کی کوئی داستان ہو۔ ہمارے گھر کے صحن میں جب کسی اڑتے ہوئے جہاز کی آواز سنائی دیتی تو ہم بہن بھائی ایک دوسرے کو با آواز بلند نظارۂ شوق کی دعوت دیتے ۔ چنانچہ کمروں میں مصروف بہن بھائی اپنی تمام تر مصروفیات کو یک لخت ترک کر کے صحن میں آ نکلتے ۔ سب کی نظریں آسمان کی طرف اٹھ جاتیں اور ہم دم سادھے، ٹکٹکی باندھے، محویت کے عالم میں اڑتے ہوئے جہاز کو حیرت اور حسرت سے دیکھا کرتے ۔ اس وقت جہاز میں بیٹھے ہوئے لوگ دنیا کے خوش قسمت ترین لوگ نظر آتے تھے جو زمین کی کشش سے آزاد ہو کر پرندوں کی طرح ہواؤں میں اڑ رہے تھے، بادلوں کی ہمراہی میں ۔ دل میں اک ہوک سی اٹھتی تھی ، کیا کبھی ہماری زندگی میں بھی ایسا دن آئے گا کہ ہم حقیر کیڑے مکوڑوں کی طرح زمین پر چلنے پھرنے کو ترک کر کے ہواؤں کے مسافر اور بادلوں کے راہی ہوں گے!

بچپن میں زمین پر کھڑے ہو کر ، ہواؤں اور بادلوں کو چیرتے ہوئے بادلوں کے ہمسر پر وقار انداز میں اڑتے ہوئے جس جہاز کا نظارہ شوق سے کیا جاتا ہے، عموماً اس کے اندر بیٹھ کر طویل سفر کرنا خوشگوار تجربہ نہیں ہوتا ، خصوصاً جب آپ اکیلے ہوں ، یا آپکے ساتھ کوئی ایسا ہمسفر بیٹھا ہو کہ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل والی صورتحال پیش آجائے ، یا سفر کا خاطر خواہ شوق نہ رکھتے ہوں ، یا آپ کو فلم دیکھنے کا شوق بھی نہ ہو، یا آپ ادھیڑ عمر کے ہوں ، یا آپ کے پاس کوئی دلچسپ کتاب نہ ہو، یا آپ عینک ساتھ رکھنا بھول جائیں ۔ اس پر مستزاد یہ کہ آپ اکانومی کلاس کے مسافر ہوں ۔ سارا راستہ آزادی سے پہلو بھی نہ بدل پائیں کہ

؎ انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

جہاز میں بیٹھ کر آپ کو یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ ایک بہت بڑے سائز کے انڈے کے خول میں بند ہو گئے ہیں ۔ سفر کے ابتدائی چند گھنٹے تسلیم و رضا کی کیفیت کے ساتھ گذر جاتے ہیں ۔ پھر ذرا الجھن سی محسوس ہوتی ہے ۔ پھر وقت کے تھم جانے کا احساس ہوتا ہے ۔ یعنی کئی گھنٹے گذر جانے کے بعد جب آپ اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اچھی بھلی تیز رو گھڑی اچانک انتہائی سست رفتار ہو چکی ہے کئی گھنٹے گذر جاتے ہیں تو اس کی سوئیاں بمشکل ایک گھنٹے کا سفر طے کرتی ہیں ۔ اس کے بعد یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ آپ پچھلے کئی سالوں سے یہیں بیٹھے ہیں ۔ اس مقام پر زندگی کے کئی ضروری کام جو التوا میں پڑے ہیں، یاد آتے ہیں ۔

جب مزید کئی گھنٹے گزر جاتے ہیں تو سب ضروری کام پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔صرف ایک خواہش سر اٹھاتی ہے کہ کاش.....اے کاش اس جہاز کو ایسے تیز رفتار پر لگ جائیں کہ بقایا گھنٹوں کا سفر منٹوں میں طے ہو جائے۔اب بے بسی کا احساس ہوتا ہے اور ہاتھ دعا کے لئے اٹھ جاتے ہیں۔زمین کے رب اور آسمانوں کے رب،اے ہواؤں کے رب اور خلاؤں کے رب۔اے پانیوں کے رب اور کہکشاؤں کے رب ۔اے مشکل کشا۔اے رب کریم مدد بس جہاز کے پہیے زمین سے لگا دے۔دروازے کھول دے کہ میں اپنے پاؤں سے زمین کو چھولوں۔ کیسی نعمت ہے تیری زمین اور کیسی نعمت ہے اس پر چلنا پھرنا۔اس مقام پر وسیع وعریض زمین پر آزادی سے چلنے پھرنے والے، بھاگنے دوڑنے والے، لمبے لمبے ڈگ بھرنے والے سب لوگ خوش قسمت نظر آتے ہیں ۔جہاز کی قید و بند سے آزاد۔اپنی مرضی کے مالک۔چاہیں تو رستہ بدل لیں۔چاہیں تو منزل بدل ڈالیں۔چاہیں تو ارادہ تبدیل کر لیں۔چاہیں تو ہمراہی بدل لیں۔چاہیں تو نقشہ بدل ڈالیں۔ادھر!

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ

لیکن اب پچھتاوے کا کیا فائدہ۔چڑیاں تو کھیت چگ گئیں.....

لو جی ہم سے تو چڑیاں ہی اچھی ہیں۔کیا آزادی سے شاخ شاخ ڈال ڈال پھدک رہی ہیں۔ایک ہم ہیں، پر کٹے پرندوں کی طرح۔بڑے سے پنجرے میں قید۔جائے رفتن نہ پائے ماندن۔

زمین پر چلنے والی کاروں میں بیٹھے ہوئے افراد پر رشک آتا ہے کہ کیسے مزے سے سٹیرنگ پر ہاتھ جما کر کار کو اپنے اشاروں پر نچا رہے ہیں۔چاہیں تو رفتار تیز کر لیں اور چاہیں تو آہستہ۔چاہیں تو سیدھے چلتے چلتے مڑ جائیں اور اگر چاہیں تو مڑتے ہوئے اچانک رخ بدل ڈالیں۔ ادھر ہم ہیں کہ

؎ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اور شکر ہے کہ ایسا نہیں ہے ورنہ جہاز میں بیٹھے ہوئے تمام تر مسافروں کی زندگیاں یقینی خطرے کی زد میں ہوں گی یعنی

؎ خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

دوران سفر اگر کبھی پرواز ناہموار ہو جائے اور جہاز ہچکولے کھانے لگے اور عملے کی طرف سے سیٹ بیلٹ باندھنے کا اعلان بآواز بلند جاری ہو جائے تو دنیا کی بے ثباتی کا احساس ہونے لگتا ہے۔اپنے گزشتہ گناہ، غلطیاں، کوتاہیاں اور کمزوریاں یکے بعد دیگرے یاد آتی ہیں۔دل انجام کے خوف سے لرز کر توبہ تائب کی طرف راغب ہونے لگتا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ کیا واقعی غالب نے بقائمی ہوش وحواس یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ

؎ نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

جب تک میں ہوائی جہاز کے اندرونی کہانی سے بے خبر تھی، میرے دل میں اسکے سفر کی خواہش چٹکیاں لیتی رہتی تھی اور ہر وقت میرے سر پر اس کی سواری کا سودا سمایا رہتا تھا لیکن جب اس کا تجربہ ہوا تو یہ خوف دامن گیر رہنے لگا کہ کہیں مجھے یہ سفر درپیش نہ آجائے لیکن سیانے کہتے ہیں کہ آپ لاکھ گھبرائیں، عقل لڑائیں، تدبیر آزمائیں، گھوڑے دوڑائیں، جان چھڑائیں، ہونی ہو کر رہتی ہے۔لہٰذا جب کبھی ہوائی سفر میرا مقدر بنتا ہے تو میرے انکار اور تکرار کے باوجود یہ ہونی ہو کر رہتی ہے۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر رخسانہ جبین[1]

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

والدین جنت کے دو دروازے ہیں۔ ہمارے لیے دنیا میں جنت کا ایک دروازہ بند ہوگیا۔ ہمارے پیارے ابو جان 17 نومبر بروز منگل اپنی نذر پوری کر کے رب کریم کے حضور پہنچ گئے۔ دعاؤں کے خزانے ختم ہو گئے۔

خوبصورت، مسکراتا، نورانی سراپا.....منوں مٹی کے نیچے جا سویا۔

؎ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

انسان بھی کتنے ظالم ہوتے ہیں.....اپنے پیاروں کو اپنے ہاتھوں سے مٹی کے سپرد کر دیتے ہیں۔ لیکن نہیں.....اللہ کا نظام ہی یہ ہے.....جو آیا ہے اس نے جانا ہے.....

لیکن والدین کا جانا کیا ہے؟

محبت کے سوتوں کا خشک ہو جانا.....دعاؤں کے خزانوں کا منہ بند ہو جانا! سر سے دستِ شفقت اٹھ جانا.....خود کو گھنی چھاؤں سے کڑی دھوپ میں کھڑے پانا! آنکھوں کا محبت بھری نگاہوں کو ترس جانا.....سر کا دست رحمت کے لمس سے محروم ہو جانا! محرومیاں ہی محرومیاں!! ہاں یادیں ہی یادیں باقی رہ جاتی ہیں.... پیاری، خوشگوار، میٹھی میٹھی یادیں!

ایک دن وہ تھا جب گجرات کے دور افتادہ گاؤں میں، ''میری آمد'' ہوئی۔ ابو جان اس وقت ائیر فورس میں تھے۔ میری پیدائش کے کچھ دنوں بعد گجرات آئے تو ڈھیر سارے تحائف لے کر آئے۔ کپڑے، کھلونے وغیرہ.....اور.....گاؤں میں باتیں شروع ہوگئیں کہ ''لو دیکھو! بیٹی پیدا ہوئی ہے اور اتنی خوشیاں اتنے تحائف؟؟''

ان نادانوں کو کیا علم کہ وہ تو بیٹیوں کی پرورش میں ''جنت کا حصول'' دیکھ رہے تھے۔ ہم تین بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ اور ہمارے والدین نے کبھی بیٹیوں کو احساس کمتری نہیں ہونے دیا اور اکلوتے بیٹے کو برابری کے ساتھ پالا۔ بلکہ اسے شکوہ ہی رہا کہ بیٹیاں زیادہ لاڈلی ہیں۔ ابو فرمایا کرتے تھے کہ تم تینوں کی طرف دیکھتا ہوں تو بخشش کی امید لگ جاتی ہے (تین بیٹیوں کی پرورش کی بشارت کے حوالے سے)۔ حالانکہ بخشش کے لیے صرف یہی امید نہیں، وہ خود بھی ''اللہ والے'' تھے۔ مسجد سے عشق کرتے تھے۔ جب تک چلنے پھرنے کے قابل رہے اذان کا انتظار نہ کرتے بلکہ اس سے قبل ہی نماز کی تیاری شروع کر دیتے۔ عموماً اذان سے قبل یا اذان کے ساتھ ہی مسجد روانہ ہو جاتے۔ بارش ہوتی، سڑک پر پانی ہوتا۔ تب بھی پائنچے اٹھاتے اور مسجد چلے جاتے۔ سوائے سخت بیماری کے ہم نے کسی چیز کو مسجد کے راستے میں مانع نہیں دیکھا۔ کرائے کا گھر لیتے وقت بھی ترجیح رکھتے کہ گھر مسجد کے قریب ہو۔ وضو بہت اہتمام سے کرتے تھے۔ بقول ہماری امی جان کے ''وضو کرتے کرتے انہوں نے اپنی کمر جھکا لی ہے''۔ وضو سے قبل ایک کپڑا یا تولیہ لے کر اپنی قمیض کے گلے سے آگے تک لٹکا لیتے تا کہ کپڑوں پر چھینٹے نہ پڑیں اور تسلی سے تمام اعضا کو دھوتے۔ سخت سردی میں بھی جرابوں پر مسح سے اجتناب کرتے۔ میں اکثر کہتی کہ ابو جان اتنی سردی ہے مسح کر لیں تو مسکرا دیتے کہ نہیں گرم پانی میسر ہے، مجھے کوئی

[1] ۔ سابق سیکرٹری جنرل حلقہ خواتین جماعتِ اسلامی

مسئلہ نہیں۔ بلکہ ہمارا مسح کرنا بھی انہیں ناپسند تھا لیکن چونکہ شرع میں گنجائش کا علم تھا اس لیے منع نہ کرتے۔ رات کو سونے سے پہلے اچھی طرح وضو کرنا ان کا معمول تھا اور یہ معمول سخت سردی میں بھی کبھی ترک نہ کیا۔

گھر میں آنے والے مہمانوں کو بھی نماز باجماعت کی تلقین کرتے۔ فجر کے وقت دروازہ کھٹکھٹا کر ہمیں اٹھانا ہمیشہ سے ان کا معمول رہا۔ شادی کے بعد جب ہمارا سرگودھا جانا ہوتا تو دروازہ کھٹکھٹا کر ساتھ ہی میاں صاحب کا نام لے کر آواز بھی لگاتے کہ جماعت میں اتنا وقت رہ گیا ہے جلدی آؤ اور خود ان کا انتظار کیے بغیر مسجد کو نکل جاتے۔ بھائی بتا رہے تھے اب جبکہ اوپر والی منزل کی سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتے تھے تو فون کر کے انھیں فجر کے لیے جگاتے تھے۔ بڑھاپے سے کمر میں خم آ گیا تھا لیکن آخر وقت تک نماز تراویح بھی کھڑے ہو کر پڑھتے رہے۔ محسوس ہوتا تھا کہ بہت مشکل سے کھڑے ہوتے ہیں" میں نے ایک دن کہا کہ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں جب اللہ نے اجازت دی ہے تو بیٹھ کر پڑھ لیا کریں تو فرمایا کہ "تراویح تو ہے ہی قیام"۔

قرآن پاک سے بہت شغف، بلکہ محبت تھی۔ خود محنت کر کے اپنی تجوید ٹھیک کی اور پھر خوب قرآن پڑھا۔ تلاوت اتنی کثرت سے اور طویل کرتے تھے کہ پڑھتے پڑھتے تقریباً آدھا قرآن (تقریباً 15 پارے متفرق سورتیں) یاد ہو گئے تھے۔ ہم لوگ جب تک ان کے گھر رہے فجر کے بعد سونا منع تھا اور سب اکٹھے بیٹھ کر تلاوت کیا کرتے۔ ہم گھر کے چھ افراد تھے (والدین اور چار بہن بھائی)۔ دو چار پائیوں پر بیٹھ جاتے اور اونچی آواز میں قرآن پاک پڑھتے۔ جس کی آواز نہ نکلتی اسے ڈانٹ پڑتی۔ ابو جان کا دھیان ہم سب کی قرات پر ہوتا اور جو کوئی غلط پڑھتا اس کو فوراً متوجہ کرتے کہ تم نے یہ آیت ٹھیک نہیں پڑھی۔

تین سال قبل بیماری کا پہلا حملہ رمضان میں ہوا۔ گرمیوں کے روزے کی شدت، بڑھاپا اور کمزوری۔ لیکن اللہ کے بندے روزہ چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ آخر ایک دن بیمار ہو گئے۔ اور کئی دن ہسپتال میں داخل رہے اور روزے چھوٹنے کا بہت قلق رہا، رنجیدہ رہے۔ میں نے تسلی دینے کو کہا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر مریض ہیں تو فدیہ دے دیں (۱۸۴-۱) فوراً فرمایا اس کے بعد اللہ نے یہ بھی تو کہا ہے اگر تم روزہ رکھو تو بہتر ہے۔ لیکن آخری دو سال صحت اس قابل نہ ہو سکی کہ روزہ دوبارہ رکھ سکیں۔ اہتمام سے فدیہ دیتے اور تلاوت و تراویح کا اہتمام کرتے کہ ادھر سے کمی نہ رہ سکے۔

1966/67ء میں ڈیپوٹیشن پر سعودی عرب گئے۔ ایک سال بعد ہمیں بھی لے گئے۔ خمیس مشیط کے پر فضا ائیر بیس پر ڈیوٹی لگی۔ ہم کراچی سے جدہ جاتے اور وہاں سے ائیر فورس کے C130 جہاز کے ذریعے خمیس مشیط روانہ ہوتے۔ اللہ و رسول ﷺ سے محبت کا عالم یہ تھا کہ جب ہم پاکستان سے سعودی عرب جاتے یا سعودی عرب سے پاکستان آتے تو جدہ سے لازماً ہمیں عمرہ کے لیے اور زیارت مدینہ منورہ کے لیے لے کر جاتے۔ مجھے کوئی سفر یاد نہیں جب ہم جدہ سے بغیر عمرہ کیے گزرے ہوں۔ سال میں ایک مرتبہ چھٹی لے کر خصوصی طور پر آٹھ دس دن کے لیے حرمین شریفین آتے۔ کیا خوبصورت دن تھے!! چھوٹا سا حرم تھا.... مختصر سی مسجد نبوی ﷺ.... تھوڑے سے زائرین ہوتے..... ہم تسلی سے حجر اسود کو بھی بوسہ دیتے اور ریاض الجنۃ میں جگہ بدل بدل کر تسلی سے نوافل ادا کرتے..... مواجہ شریف میں جالیوں کے سامنے جا کر جی بھر کر درود شریف پڑھتے..... تب عورتوں کے لیے اوقات مخصوص نہ تھے بلکہ ہر وقت جا سکتی تھیں۔ ہر مرتبہ ہمیں زیارتیں بھی کراتے۔ میدان بدر بھی لے کر گئے اور دیگر کئی زیارتیں جو آج کل نہیں کرائی جاتیں ہمیں وہ بھی کرائیں۔ ساتھ ساتھ ان کی مختصر تاریخ بھی بتاتے۔ مدینہ شریف میں ہماری بہت موج ہوتی تھی۔ وہاں کسی بات پر ڈانٹ نہیں پڑتی تھی۔ کوئی غلطی ہو جاتی تو ابو جان کہتے، یہ مدینہ شریف ہے، نبی کریم ﷺ کے گھر میں آ کر تمھیں ڈانٹ نہیں سکتا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ناپسند فرمایا ہے۔

بہترین مربی:

ائیر فورس کی ملازمت کے دوران جہاں رہے ہماری تربیت کے پیش نظر ہمیں اپنے ساتھ رکھا تاکہ ہماری تربیت میں کوئی رخنہ نہ رہے۔ وہ ایک شفیق والد تھے لیکن تربیتی معاملات میں سختی بھی کرتے تھے۔ فرائض اور سنت رسول ﷺ پر عمل کے معاملے میں نرمی نہ کرتے۔ عموماً کھانے کے موقع پر ہمیں چھوٹی چھوٹی سنتیں بتاتے اور ہدایات دیتے رہتے اور پھر وقتاً فوقتاً اس کو چیک کرتے۔ مثلاً دائیں ہاتھ سے

کھانا کھانا۔ روٹی بائیں ہاتھ میں پکڑنے پر بہت ناراض ہوتے اور کہتے کہ پلیٹ میں روٹی رکھ کر کھاؤ۔ کپڑے پہننے، واش روم جانے اور دیگر چھوٹی چھوٹی سنتوں کے اہتمام پر متوجہ رکھتے۔ اگر کبھی غلطی سے واش روم میں دایاں پاؤں پہلے رکھ دیتے تو کہتے باہر آؤ اور پھر واپس جاؤ اور یاد کرو کون سا پاؤں پہلے اندر کرنا ہے۔ اذان کا جواب دینا سکھایا اور اذان کے وقت خاموشی اختیار کرنے کا سخت حکم دیا۔ جب تک ہم چھوٹے تھے حال یہ ہوتا تھا کہ ہمارے ہاں اذان کے وقت مکمل خاموشی (pin drop silence) ہوتی۔ اگر ہم کھانا کھا رہے ہوتے تو مجال نہیں ہوتی تھی کہ چمچ کی آواز بھی آئے۔ گھر داخل ہوتے ہوئے کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ سلام نہ کیا تو کہا کہ واپس جاؤ اور سلام کر کے داخل ہو۔ اس طرح سنتیں پختہ کیں۔ کھڑے ہو کر کھانا کھانا سخت ناپسند کرتے تھے۔ میری شادی کے موقع پر قدرے تنگدستی کے حالات تھے لیکن ان دنوں کے رواج کے برعکس کھانے کے لیے کرسیوں کا خصوصی اہتمام کیا تا کہ سنت رسول ﷺ کی خلاف ورزی ہماری وجہ سے نہ ہو۔

آج یاد کرتی ہوں کتنے پاکیزہ بیج تھے جو انہوں نے ہماری بنیادوں میں ڈال دیے تھے۔ جنہیں بعد میں مطالعہ قرآن و حدیث نے جلا بخشی اور جمعیت اور جماعت نے تناور درخت بنا دیا۔ اللہ انہیں اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے اور کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے۔

تربیت کے کتنے پہلو ہوتے ہیں، شاید ہی کوئی انہوں نے تشنہ نہ چھوڑا ہو۔ ہمیں ہمیشہ خود پڑھایا۔ گرمیوں کی دوپہر کو تھکے ہارے دفتر سے آتے اور کھانے سے فارغ ہو کر ہمیں لے کر بیٹھ جاتے۔ انگلش اور حساب میں ہمیں طاق کر دیا تھا۔ انگلش گرائمر اتنی عمدہ پڑھائی کہ F.Sc تک ہمارے لیے انگلش کا پیپر کبھی مسئلہ نہ بنا حالانکہ ہم اردو میڈیم سکولوں میں پڑھتے تھے۔ بلکہ نویں کلاس کا ایک واقعہ میرے لیے نا قابل فراموش ہے۔ کلاس میں ٹیچر direct indirect کروا رہی تھیں۔ ایک جملے کی مشق کرائی اور غلط بتا دیا۔ میں نے کھڑے ہو کر کہا مس یہ ایسے نہیں ایسے ہے۔ مس نے کہا نہیں ایسے ہے۔ میں نے دو تین مرتبہ اصرار کیا مگر مس نہ مانیں تو میں اضطرار سے بیٹھ گئی۔ مس کچھ دیر بعد گویا ہوئیں، رخسانہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو، اور ساری کلاس کو درست جملہ لکھوایا یہ ان کا دیا ہوا اعتماد تھا۔

خلاصہ، گائیڈ، ٹیسٹ پیپر وغیرہ کا داخلہ گھر میں ممنوع تھا۔ میں ایف ایس سی میں ایک لڑکی کی گائیڈ بک گھر لے آئی۔ ابو جان کی نظر پڑ گئی، ضبط کر لی اور کہا واپس بھی نہیں دوں گا کہ اس کو دے سکو، اس کو جلا دوں گا۔ بڑی مشکل سے معافی ملی۔ ان کا حکم ہوتا تھا کہ خود محنت کرو، سوالات کے جوابات خود تلاش کرو، پورا سبق پڑھو اور جواب دو۔ تخلیقی صلاحیتیں ابھارنے، مضامین لکھنے میں راہنمائی فراہم کرتے اور کہتے کہ خود لکھو۔ میں نے بچپن میں ''میرا سکول، میرا استاد یا میرے والدین'' جیسا کوئی بھی مضمون لکھا، خود لکھا اور اسی کا یہ ثمر ہے کہ آج اللہ نے تحریر کے راستے پر لگا دیا ہے۔ اردو زبان درست کرنے کے لیے مجھے بچپن میں ''اردو ڈائجسٹ'' پڑھایا کرتے تھے۔ اس سے مطالعہ کا شوق بھی بڑھا اور زبان پر عبور بھی حاصل ہوا۔ تحریک سے منسلک ہو کر جب میں نے لکھنا شروع کیا اور میری تحریریں چھپنے لگیں تو بہت خوش ہوتے تھے۔ جب میرا پہلا کتابچہ چھپا اور میں ان کے پاس لے کر گئی تو ان کی خوشی اور میٹھی میٹھی مسکراہٹ آج بھی میرے لیے سرمایہ حیات ہے۔

دین کے بارے میں ہمارے خاندان کا پس منظر روایتی تھا۔ ابو جان کی وجہ سے گھر میں عقائد درست ہوئے لیکن بہت سی سوچیں باقی رہ گئیں۔ اب مجھے اکثر وہ دن یاد آتے ہیں جب جمعیت میں شامل ہونے کے بعد میں کئی مسائل میں الجھن کا شکار ہو جاتی تھی تو ابو جان کو لمبے لمبے خط لکھتی تھی (ان دنوں موبائل فون نہ ہوتے تھے)۔ اور ابو جان کا تسلی بھرا، لیکن مختصر جواب آتا ''بیٹا علم حاصل کرو علم آئے گا تو ساری الجھنیں دور ہو جائیں گی''۔ واقعی ایسا ہی ہوا۔ مولانا مودودیؒ کا لٹریچر دین کی ایسی شفاف تعبیرات پر مشتمل تھا کہ رفتہ رفتہ سارے مسائل حل ہو گئے خصوصاً تفہیم القرآن، خطبات، اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات وغیرہ کے مطالعہ سے جیسے آنکھیں کھل گئیں۔ الحمدللہ۔ لیکن میں سوچتی ہوں کہ کتنا حکمت بھرا جواب دیتے تھے۔ اگر میرے ایک ایک سوال کا جواب خود لکھتے تو شاید یہ فوائد نہ ہوتے۔ جمعیت میں شامل ہونے کے بعد اکثر دعوتی و تنظیمی پروگراموں کے لیے گھر سے نکلنا پڑتا، ایک قریبی رشتہ دار نے اعتراض کیا ''تم کہاں پھرتی رہتی ہو''، ابو جان نے سختی سے جواب دیا کہ ابھی میں

زندہ ہوں، میری بیٹی ہے مجھے معلوم ہے کہاں جاتی ہے۔

وقت کی پابندی اور احساس ذمہ داری بھی ہمیں نہ صرف زبان بلکہ اپنے عمل سے سکھائی۔ جمعیت کے پروگرامز میں جب انہیں بتا دیتی کہ اتنے بجے پروگرام ہے تو مسلسل مجھے یاد دہانی کراتے رہتے کہ اتنا وقت رہ گیا ہے وقت پر پہنچو۔ خود اگر کبھی میرے پاس فاطمہ جناح میڈیکل کالج کے ہوسٹل میں آنے کا کوئی وقت دیتے تو عموماً اس سے قبل پہنچ جاتے اور کبھی مسکراتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہتے ''ہم فوجی آدمی ہیں وقت کے پابند ہیں''۔ ایف جے میڈیکل کالج کا تذکرہ چلا تو یاد آیا..... میرے پیارے ابو جان نے پانچ سال سفروں میں میرے محرم کی ذمہ داری سنبھالی۔ اگر ساتھ جانے والا کوئی گروپ نہ ہوتا تو کبھی تنہا نہ چھوڑا۔ لے کر بھی جاتے اور چھٹیوں میں واپس بھی خود لاتے۔ مجھے بغیر محرم کے سفر بہت ناپسند تھا تو اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر بڑے خصوصی احسانات فرمائے۔ جمعیت اور طالبعلمی کے دور میں ابو جان نے ذمہ داری سنبھالی اور جماعت میں آنے کے بعد میرے میاں صاحب نے مجھے کبھی تنہا نہ چھوڑا۔ فِللہ ا لحمد۔ بنیادی انسانی اخلاقیات میں ''جھوٹ'' سے سخت نفرت پیدا کی اور کبھی انہیں شک پڑا کہ ہم نے جھوٹ بولا ہے تو سزا دینے سے بھی گریز نہ کیا۔

ہمارے معاشرے میں مردانگی کا تصور ایک رعب بھرے باپ، بھائی اور شوہر کا تصور ہے، لیکن ابو جان ایک شفیق والد تھے۔ نرم مزاجی، مسکراہٹ بلکہ ہنسی مذاق ان کی طبیعت کا خاصہ تھے۔ بیٹے اور نواسوں کے ساتھ محبت بھری کُشتی بھی اس وقت تک ان کا معمول رہی جب تک صحت اور جسم نے ساتھ دیا۔ اور ''نواسے'' نانا ابو کو ہرا کر فاتحانہ مسکراہٹ سے ان کی طرف دیکھتے تو سارا ماحول زعفران زار ہو جاتا۔ میرے لیے تو ابو جان ایک ایسی ہستی تھے جن سے میں اپنے مسائل ہی نہیں، بچپن میں اپنے بعض راز بھی شیئر کرتی اس وعدے پر کہ امی جان کو نہیں بتائیں گے۔ اور پھر اس وقت بڑا دلچسپ مکالمہ ہوتا جب میں ابو کی کوئی بات ماننے میں پس و پیش کرتی تو کہتے ''اچھا پھر بتاؤں تمہاری امی کو فلاں بات؟'' اور میں فوراً ہتھیار ڈال دیتی..... یادِ ماضی عذاب ہے یارب!!

ابو جان صرف شفیق باپ نہ تھے بلکہ بہت تعاون کرنے والے اور خیال رکھنے والے شوہر بھی تھے۔ اللہ کے فضل سے ہمارے گھر کا ماحول بہت پرسکون اور (اب اتنی عمر گزار لینے کے بعد مجھے احساس ہوتا ہے) مثالی تھا۔ والدین کی بیشتر زندگی بس متوسط سے بھی کچھ کم درجے کی آمدن میں گزری۔ لیکن دونوں کے تعاون، سلیقے اور توکل علی اللہ کی برکات سے ہم سب بہن بھائی نہ صرف پڑھ لکھ گئے بلکہ الحمدللہ بہترین صلاحیتوں سے بھی بہرہ مند ہوئے اور اب سب آسودہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مجھے بچپن کے کچھ منظر یاد آتے ہیں.....

گھر میں کبھی کسی کام والی کو نہ دیکھا۔ امی کپڑے دھو رہی ہیں۔ ابو بالٹی اٹھا کر کپڑے تار پر ڈالتے جا رہے ہیں۔ سردیوں کی راتیں ہیں۔ امی ہمیں ایک ایک کر کے نہلاتی جا رہی ہیں۔ ابو جان ہمیں باری باری اٹھا کر اندر لے جاتے ہیں اور کپڑے پہنا کر کمبل اوڑھا رہے ہیں۔ اور اس طرح کے کتنے ہی منظر نظر آتے ہیں۔ ایک عجیب بات بھی یاد آتی ہے کہ ابو اپنی کسی ضرورت کے لیے امی سے پیسے مانگ رہے ہیں..... معلوم ہوتا کہ ہر ماہ کے شروع میں ساری تنخواہ لا کر امی کے ہاتھ پر رکھ دیتے اور پھر دونوں تعاون اور سلیقے سے جتنے پیسے میسر ہوتے اس میں مہینہ گزارتے۔ امی ابو دونوں مہمان نواز تھے۔ ہمارے گھر میں مہمانوں کی بکثرت آمد ہوتی لیکن عسرت کے باوجود کبھی ان کی پیشانی پر شکن نہ دیکھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب بھائی اور بھابی بھی بہت مہمان نواز ہیں اور اس گھر کی روایات قائم ہیں۔

جب میرا میڈیکل میں داخلہ ہوا تو بڑی بیٹی ہونے کی وجہ سے گھر کے حالات سے اچھی طرح واقف تھی۔ قدرے فکرمند تھی کہ والدین گزارہ کیسے چلائیں گے۔ ابو جان نے میری سوچیں بھانپ لیں اور فرمایا ''تم نے ہوسٹل میں غریب بن کر نہیں رہنا۔ یہ میری ذمہ داری ہے کہ تمہاری ضروریات پوری کروں۔ تم فکرمند نہ ہونا''۔ ان کے جملے مجھے آج بھی آبدیدہ کر دیتے ہیں۔ ہاں اکثر والدین اسی طرح اولاد کی پرورش کرتے ہیں۔ قربانیاں، محنت، مشکلات سب کچھ اپنے اوپر سہتے ہیں اور جب بچے کچھ بن جاتے ہیں تو کہتے ہیں ''آپ نے کیا کیا؟'' وہ سمجھتے ہیں ساری ہماری اپنی محنت ہی تو تھی جس کے بل بوتے پر اس جگہ پہنچے ہیں۔

غور کریں اور یاد رکھیں تو والدین کی محبتوں، شفقتوں کے ساتھ ساتھ جدوجہد کی ایک تاریخ ہوتی ہے جو انسانوں کو قدآور بناتی ہے

۔ایک وقت ہوتا ہے جب بچے چھوٹے ہوتے ہیں تو والدین کے نام سے پہچانے جاتے ہیں کہ یہ فلاں کے بچے ہیں۔ اور ہونہار اولاد جب والدین کی عمر بھر کی محنت اور دعاؤں سے کسی مقام پر پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو پھر والدین اس کے نام سے پہچانے جاتے ہیں کہ یہ فلاں کے ''والد'' یا ''والدہ'' ہیں۔ کتنی خوش قسمت ہوتی ہے وہ اولاد جس کو ایسے ایمان وعمل والے والدین ملیں۔ اور کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ والدین جو اپنے ہاتھوں کے بوئے بیجوں سے اپنی اولاد کو پھلتے پھولتے دیکھتے ہیں۔ جوان کے لیے نہ صرف دنیا میں آنکھوں کی ٹھنڈک بنے بلکہ ہمیشہ کے لیے صدقہ جاریہ بھی بن جائے۔

ابو جان کے ایک دوست کے بچے پڑھ لکھ نہ سکے لیکن انہوں نے بچوں کے لیے کافی جائیداد وغیرہ بنا لی۔ ہمارے ابو جان ہماری تعلیم و تربیت کے اخراجات کی وجہ سے زندگی بھر شہر میں اپنا مکان بھی نہ بنا سکے (چند سال قبل بھائی نے گھر بنایا اور والدین کرائے کے گھر سے اپنے گھر میں شفٹ ہوئے)۔ایک دن وہ دوست ابو جان سے کہنے لگے ثناء اللہ! آپ نے اپنے بچوں کے لیے آخر اب تک کیا بنایا ہے؟؟ ابو کے جواب دینے سے قبل ایک دوسرے دوست جو پاس ہی بیٹھے تھے کہنے لگے، جو کچھ انہوں نے اپنے بچوں کو بنا دیا، آپ وہ نہیں بنا سکے!!

اے اللہ! اے میرے پیارے اللہ! میں اور میرے سب بہن بھائی گواہی دیتے ہیں کہ ہمارے ابو جان ہمیں اچھے انسان ہی نہیں بہتر مسلمان بنانے کے لیے کوشاں تھے، ہماری اچھی پرورش کے ذریعے وہ تجھ سے بخشش اور جنت کی امید رکھتے تھے۔ اے رحیم وکریم ربّ! ان کو بخش دے اور ہمیں ان کی کوششوں کا مصداق بنا، آمین۔

پچھلے دو تین سال سے ان کی صحت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ دو مرتبہ اتنے شدید بیمار ہوئے کہ کئی کئی دن ہسپتال داخل رہے۔ پھر اللہ نے شفا دے دی لیکن کمزوری بڑھتی چلی گئی۔ رخصتی سے چند دن قبل جیسے ذہنی طور پر تیار تھے، گھر والوں سے بار بار کہہ رہے تھے ''میں اب تمہارے پاس مہمان ہوں''۔ وفات سے دو دن قبل اپنی چہیتی نواسی کو فون کیا کہ ہاسٹل جانے سے قبل مجھے مل کر جانا۔ وہ ملنے آئی تو پیار سے کہا میرا آخری وقت آنے والا ہے تم نے صبر کرنا ہے رونا نہیں۔ میرا بیٹا ملنے کے لیے گیا تھوڑی دیر بیٹھ کر اٹھا کہ نانا ابو دوبارہ آؤں گا تو زیادہ دیر رکوں گا، تو کہا، دوبارہ کس کی ملاقات ہوگی!

اس کے تین دن بعد ہی.....اپنے صبح کے اذکار وغیرہ سے فارغ ہو کر دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ پیغام اجل آ گیا اور چند منٹوں میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ہمارے پہنچنے تک ان کو آخری غسل دیا جا چکا تھا۔ پھولوں میں لپٹے چہرے سے جیسے نور نکل رہا تھا۔ دیکھ کر میرے منہ سے بے ساختہ الحمد للہ نکلا، بلا مبالغہ یوں لگ رہا تھا جیسے ان کا چہرہ چمک رہا ہے۔ رنگ صاف ہو چکا تھا۔ بڑھاپے کی جھریاں بھی کم ہو چکی تھیں اور جلد کے داغ بھی مدہم پڑ چکے تھے۔ میرے چھوٹے بیٹے نے دیکھتے ہی کہا، امی نانا ابو تو جوان لگ رہے ہیں!! چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ بھائی نے بتایا کہ جسم میں اتنی لچک تھی کہ غسل دینے کے لیے میں نے انہیں بٹھا کر کپڑے اتارے، کپڑے کاٹنے نہ پڑے اور جب کمر سے قمیض اٹھائی تو مجھے لگا کہ جیسے نور کی کوئی لپٹ نکلی ہو۔ اور اس نے یہ بھی بتایا کہ میں حیران ہو گیا کہ جلد کی بیماری کی وجہ سے ان کے جسم پر جو داغ تھے وہ سب غائب ہو چکے تھے۔ بھابی کہتی ہیں کہ میں نے جب چہرہ دیکھا تو سمجھی کہ میں نے عینک نہیں لگائی اس لیے مجھے جلد صاف لگ رہی ہے۔ بعد میں عینک لگا کر دیکھا تو واقعی سب داغ غائب تھے۔

رات آٹھ بجے جنازہ اٹھایا گیا۔ جنازے میں شامل افراد میں سے ایک نے کہا، کچھ ایسا منظر تھا لگ رہا تھا کہ بابا جی کی برات جا رہی ہے۔ ایک بھائی نے کہا رات تھی لیکن کوئی سماں تھا۔ یہ مناظر دیکھ کر قبر پر دعا کرانے والے نے کہا ''اے اللہ! ہمیں بھی ایسی موت نصیب فرما''۔ ان کی اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ محترم امیر جماعت جناب سراج الحق صاحب نے اپنی مصروفیات کے باوجود وقت نکالا اور نماز جنازہ پڑھائی۔

ان کے رخصت ہونے کے بعد ہم نے عہد کیا کہ کوئی نہ کوئی ایسا مخصوص عمل کریں گے جو ان کے لیے صدقہ جاریہ ہو۔ یہ قلق ہمیشہ رہے گا کہ بیٹیاں ہونے کے ناطے دور رہ کر ہم والدین کی کوئی خدمت نہ کر سکے۔ بھائی خوش قسمت ہے کہ اس نے ان کی خدمت بھی کر لی، راتوں کو ان کے ساتھ جاگ کر تیمارداری بھی کر لی۔ بھابی نے بھی ان کی خوراک اور آرام کا خیال رکھا۔ اللہ سب کو بہترین اجر عطا فرمائے آمین۔ دعا ہے ہم ابو جان کے لیے صدقہ جاریہ بن کر ان کی محبتوں اور شفقتوں کا

شہناز یونس

تاریخ کا عظیم ترین شخص

تھامس کارلائل کا خراجِ عقیدت اس ہستیؐ کے نام جس نے انسانیت کو عظیم انقلاب سے آشنا کیا

بہترین بدل دے سکیں۔ اللہ ان کی بہترین میزبانی فرمائے، ان کی قبر کو حدِ نگاہ تک وسیع کردے، جنتوں میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔

یارب کریم! ہم اپنے ٹوٹے پھوٹے اعمال کے ساتھ تیری بے حدو حساب رحمتوں کے امیدوار ہیں اور اس جنت کی آس پر جی رہے ہیں جہاں سب اکٹھے رہیں گے اور جدائیوں کے غم ختم ہو جائیں گے۔ تیرا وعدہ ہے نا کہ جیسا تیرے بارے میں سوچیں گے تجھے ویسا ہی پائیں گے!!

☆☆☆

اپنی کم علمی و کم مائیگی کا احساس ہمیشہ ہی رہا نہ اپنے آپ کو اس قابل کبھی نہیں سمجھا کہ کچھ لکھ سکوں ہم کتنے بھی گنہگار ہوں ہمارے دل نبی پاکؐ کی محبت سے سرشار رہتے ہیں تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کا کرم ہے۔

ربیع الاول کے مبارک مہینہ میں حضورِ پاک کے بارے میں ایک مغربی عظیم مفکر کے خیالات پہلی دفعہ پڑھنے کا موقع ملا تو اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکی اور دل میں شدید خواہش اٹھی کہ یہ سب ''بتول'' کے قارئین سے بھی share کروں۔

تھامس کارلائل Thomas Carlyle ایک برطانوی باشندہ تھا، 1795ء میں پیدا ہوا اور 88 برس کی عمر میں 1881ء میں وفات پا گیا۔ اللہ اُس پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے وہ ایک سچا عاشق رسول تھا۔ ڈاکٹر شبیر احمد (فلوریڈا امریکہ) کی کتاب ''خراجِ عقیدت'' میں کارلائل کے وہ لیکچر جو انہوں نے 1840ء میں حضور پاکؐ کی شخصیت کے ہر پہلو پر دیئے اُسی سے اقتباس لیا ہے۔ نورہ کارلائل جو تھامس کارئل کی پانچویں نسل سے ہیں، انہوں نے یہ لیکچر برمنگھم سے ڈاکٹر بشیر احمد کو بھیجا۔ یہ پورا لیکچر جو انہوں نے ایڈنبرا کے شاہی آڈیٹوریم میں 500 سامعین کے سامنے دیا، کچھ ہی عرصہ بعد اُن کی مشہور زمانہ کتاب "On heroes, hero worship and the heroic in history" میں ایک درخشاں باب بن کر شائع ہوا۔ حضور اکرم ﷺ کی محبت میں سرشار اس انگریز کا ایمان اور یقین ملاحصہ فرمائیں کہ 8 مئی 1840ء بروز جمعہ تھامس کارلائل نے ایڈنبرا کے شاہی آڈیٹوریم میں صبح 9 بجے اپنا لیکچر شروع کیا اور رات 9 بجے تک اتنے جذبے، دل کی گہرائی اور عقیدت سے بولتا رہا کہ مسلسل بارہ گھنٹے تک سامعین ٹس سے مس نہ ہوئے۔

''صاحبو! دین و مذہب اپنی معراج پر ایک مقدس ہستی کے طفیل ہوا۔ انقلاب! ایک عظیم انقلاب، اتنی زبردست گہما گہمی، انسانوں کے خیالات میں، افکار میں، گویا ایک نئی کائنات! ان کی عظمت ایسی عظمت، کہ محمدؐ چاہتے تو دنیا انہیں خدا کی طرح پوجتی۔ ان کی بلندی وہ بلندی، کہ محمدؐ کے بعد کوئی شخص خود کو اُن کا ہمسر نہ سمجھ سکے۔ ایسا انقلاب کہ آپؐ کے بعد کوئی شخص خدائی کا دعویٰ کرنے سے پہلے مر جائے، اس لئے کہ تاریخِ عالم کا یہ عظیم ترین شخص خود کو محض ایک بشر کہتا رہا۔ انسان کی چھپی ہوئی آرزوؤں کی تکمیل وہ شخص، جو خدا تو نہیں لیکن خدا سے جدا بھی نہیں۔ وہ انسان جو خدا کی رضا چاہے اور خدا اُس کی رضا چاہے ان معنوں میں محمدؐ خدا سے جدا نہیں تھے۔ لوگ حیران و سرگرداں کہ ان کے اعزاز و احترام کا حق کیسے ادا کریں۔ کیا ہم انہیں کامل کہہ سکتے ہیں؟ جی ہاں کہہ سکتے ہیں۔ ہر عمر میں ہر حال میں ہر محل و مقام میں وہ اپنے ساتھیوں کے ہیرو رہتے ہیں اور مخالفین کے بھی ہیرو! آپ چاہیں تو اسے ہیرو پرستی کہہ

لیں.....جی ہیرو پرستی: معزز سامعین! میں آپ کو محمڈن بن جانے کی تبلیغ نہیں کر رہا میں اس عظیم ہستی کے بارے میں ہر ہر اچھی بات کہوں گا جو میں انصاف کے ساتھ کہتا ہوں۔

محمدؐ کے بارے میں ہمارے موجودہ خیالات (1840ء) کہ وہ (نعوذ باللہ) ایک جعلی پیغمبر تھے اور ان کا پیش کردہ مذہب بے سروپا عقیدوں کا مجموعہ ہے، غور وفکر کی روشنی میں یہ خیال صاف پگھلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جس دروغ گوئی کا انبار ہم نے اس مقدس ہستی کے گرد لگا دیا ہے وہ اس عظیم ہستی کے لئے نہیں ہم مسیحیوں کے لئے باعث نرم ہے۔ گزشتہ 12 صدیوں کے نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے اس پیغمبر عالی مقام کا پیغام آج بھی 18 کروڑ انسانوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ (یہ لیکچر 1840ء میں دیا گیا جب کہ آج کے حساب سے بارہ صدیاں ہی گذری تھیں اور مسلمانوں کی تعداد 18 کروڑ ہی تھی) کیا یہ 18 کروڑ انسان خدا کے بنائے ہوئے نہیں ہیں؟ اگر ہم ان تمام کروڑہا افراد کو بھٹکے ہوئے اور گم کردہ سمجھیں تو سوچنے کا مقام ہے کہ کیا جعلی پیغام 12 صدیوں تک اس کامیابی سے بڑھ سکتا ہے؟ کیا میرے ہم مذہب بھائی بہن یہ بات نہیں جانتے کہ آج بھی کرۂ ارض میں قرآنِ کریم کے اصول آگے بڑھ رہے ہیں۔ بناوٹ بناوٹ ہوتی ہے اور اسے ظاہر ہونے میں صدیاں نہیں لگتیں۔

ایک عظیم انسان اور ایک عظیم ترین انسان محمدؐ صرف سچا ہوسکتا ہے، سچ کے سوا کچھ نہیں۔ مخلص.....اخلاص کا مجسم پیکر! گہرا خلوص.....عظیم خلوص.....اصل خلوص..... یہ ہے آپ کی عظمت کی پہلی شان! ایک ایسی ہستی جو بنی نوع انسان کے ساتھ اور اپنے خدا کے ساتھ اتنا مخلص ہے کہ دوسرے تو دوسرے شاید اس نے خود بھی اپنے اخلاص پر کبھی شک نہ کیا ہو۔ ہم اُسے شاعر کہیں، پیغمبر کہیں، خدا کہیں، کیا کہیں! ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اُس کی ہر بات حقیقت کی اتھاہ گہرائیوں سے ابھرتی ہے۔

خدا نے پہلے بھی کئی بار وحی بھیجی ہے لیکن کیا خدا نے محمد ﷺ کو آخری نبی نہیں بنایا؟ ایک ایسی زندگی کا حامل فرد جو شعلۂ جوالہ ہو، ایسا شعلہ جو فطرت کے سینے سے نمودار ہوا ہوتا کہ دنیا کو روشن کر دے۔ خالقِ کائنات کے حکم سے ہی روشنی کا یہ شعلہ ابھر سکتا تھا آپ جانتے ہیں کہ سب سے بڑی خامی انسان میں کیا ہوسکتی ہے؟ اپنی خامیوں سے ناآشنا رہنا! ہم اس ہستی کا ذکر کر رہے ہیں جو انسانِ کامل ہونے کے باوجود روزانہ ستر بار اپنے رب کے حضور استغفار کرتا ہے۔ وہ لوگ جو محمدؐ کے کردار پر انگشت نمائی کرتے ہیں آپ کو جاننا چاہیے کہ وہ اپنے جھوٹ کا جالا کہاں بنتے ہیں؟ ان لوگوں کے حسد پر جنہوں نے دو تین صدیوں بعد اس مقدس ہستی کے بارے میں کہانیاں گھڑیں۔ خدا کی قسم محمدؐ اتنے عظیم انسان تھے کہ اگر انہوں نے کوئی غلطی بھی کی ہوتی تو زمانے بھر کے لئے بھلائی اور خوبی کا معیار بن جاتی۔ میں آپ کو ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ نسل در نسل دنیا میں لوگ آتے رہیں گے، جاتے رہیں گے۔ صحرا کے اس فرزند کی عظمت کو پوری طرح ایک شخص بھی سمجھ نہ سکے گا۔ ریت کے سمندر میں پیدا ہونے والی ہستی دنیا بھر کو گلزار بنانے کا درس دے گئی۔

ایران کو مشرق کا فرانس کہتے ہیں۔ عربوں کو مشرق کے اطالوی کہتے ہیں۔ آپ صحرا میں کسی بدو کسی مسلمان کے خیمے میں پہنچ جائیں اگر آپ اس کے جانی دشمن بھی ہوں گے یا اس کے لئے دریاؤں کی طرح اجنبی وہ آپ کی مہمان نوازی کے لئے اپنی آخری بھیڑ کو بھی قربان کر دے گا۔ وہ آپ کی خاطر داری کو عبادت سمجھے گا صحرائی عرب کو آپ یہودی کی طرح باحواس دیکھیں گے لیکن اس سے بڑھ کر اس میں وہ متانت، سادگی اور وقار ملے گا جو آپ یہودی میں نہیں پائیں گے۔ یہ خوبیاں اسے کس نے سکھائیں؟ محمدؐ نے!''

☆.....☆.....☆

بتول دیارِ غیر میں

کچھ عرصہ پہلے کسی نے مجھ سے پوچھا ''آپ اپنی پڑھائی کے ساتھ بتول پڑھنے کا وقت کیسے نکال لیتی ہیں۔اور سنا ہے کہ آپ لکھتی بھی ہیں''۔ میں نے سرسری سا جواب دیا کہ بتول پڑھنے کے لئے وقت نکالنے کی ضرورت نہیں ہوتی میں تو بتول چلتے پھرتے پڑھ لیتی ہوں۔کبھی بس میں سفر کرتے ہوئے یا اسٹاپ پر انتظار کرتے ہوئے۔اور پھر اردو میں پڑھا بھی تیزی سے جاتا ہے۔ وہ کچھ مطمئن ہوگئیں۔کہ وہ تو خود ڈرائیو کرتی ہیں اس لئے پڑھنے کا وقت نہیں ملتا۔بات آئی گئی ہوگئی۔ میں نے انہیں تو مطمئن کردیا لیکن خود ایک عجیب سی بیکلی کا شکار ہوگئی۔دو تین مرتبہ سوچا کہ کیا واقعی ہی ایسا ہے؟

جلد ہی مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔کہ 'بتول میں چلتے پھرتے نہیں، بلکہ تنہائی اور اداسی میں پڑھتی ہوں تاکہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے دوبارہ کام شروع کروں'۔ہوا کچھ یوں کہ ایک دن میں ڈیپارٹمنٹ میں اکیلی تھی ایک ایک کر کے سب لوگ ہی رات ۸ بجے تک چلے گئے۔میرا آج دیر تک کام کرنے کا ارادہ تھا لہذا عشاء ؒ کی نماز پڑھ کر کام شروع کرنے کا ارادہ کیا۔دل ایک دم ہی بہت اداس ہوگیا تھا اور تنہائی کا احساس بھی بڑھ گیا تھا۔نماز سے فارغ ہوکر پڑھنا چاہا تو رونا آ گیا۔پڑھنا ویسے بھی مشکل ہے اور اکیلے پڑھنے کا خیال خودترسی کو بڑھا دیتا ہے۔میں نے بتول نکالا اور پرانے میگزین پڑھنے لگی۔اتفاق سے مارچ ۲۱۰۲ کے میگزین میں عظمیٰ پروین کا ''صبر'' نظر آیا، پڑھنے لگی۔سورہ البقرہ (۶۴۱) کی یہ آیت پڑھ کر تو جیسے دل کو سکون مل گیا کہ ''اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

اسی طرح کچھ دن گزر گئے۔ایک دن اپنا پریزنٹیشن تیار کرنا تھا۔کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیسے شروع کروں۔میں نے ذہن بٹانے اور اسٹریس سے نمٹنے کیلئے بتول نکال کر پڑھنا شروع کیا۔آدھے گھنٹے بعد ہی میں تازہ دم تھی اور کام میں جت گئی۔ چند دن بعد دل بڑا خوش تھا مگر میں ڈیپارٹمنٹ میں اکیلی تھی۔کام بھی کچھ خاص نہ تھا اور ابھی گھر بھی نہ جا سکتی تھی۔لہذا بتول کھول کر پڑھتی رہی اور خوش ہوتی رہی۔ایک دم ہی ایک شعر ذہن میں آیا۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا   کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس دن مجھے احساس ہوا کہ اچھی کتاب کو بہترین ساتھی کیوں کہتے ہیں۔میں تو غم ہو یا خوشی، اداسی ہو یا تنہائی ہر حال میں بتول میں کچھ نہ کچھ پا لیتی ہوں جس سے دل کی حالت بدل جاتی ہے صرف یہی نہیں بلکہ ایک دن میں اپنے ۵۱ سالہ بیٹے کی بات سن کر سوچ رہی تھی کہ اسے کیا جواب دوں بے خیالی میں بتول پر نظر پڑی روبینہ عاطف کا (جنوری ۵۱۰۲) مضمون ''کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور'' پڑھ کر نہ صرف مجھے اپنی پریشانی کا حل مل گیا بلکہ ایک دم ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بہت ہی ہمدرد سا ساتھی پاس ہے جس سے اپنے دل کی باتیں کر کے دل کا بوجھ بھی ہلکا لگنے لگا اور بہترین مشورہ بھی مل گیا۔ تب میں نے سوچا بتول تو میرا سب سے اچھا دوست ہے کیونکہ جب میں اداس ہوتی ہوں تو اسے پڑھ کر اپنی اداسی دور کرتی ہوں، جب اکیلی ہوتی ہوں تو بتول میری تنہائی کا ساتھی ہوتا ہے میرے آنسو جذب کر لیتا ہے اور جب میں خوش ہوتی ہوں تو میری خوشی شیئر کرنے کے لئے موجود ہوتا ہے۔

صرف اتنا ہی نہیں ایک دن ہم ایک سیشن اٹینڈ کر رہے تھے۔کہ پروفیسر نے ہمیں گروپ ڈسکشن کے لئے سوال دیا کہ ''آپ لوگ ریلیکس ہونے کے لئے کیا کرتے ہیں؟''۔سب نے مختلف ہابیز کا ذکر کیا میں نے کہا کہ ''میں ایک اردو میگزین میں لکھتی ہوں''۔ پروفیسر نے متوجہ ہوکر پوچھا کہ ''میگزین کا نام کیا ہے؟ میرے بتانے پر فوراً بورڈ پر لکھا اور پھر بتول کے بارے میں کئی سوال کر ڈالے۔ ہر جواب کو وائٹ بورڈ پر لکھتے رہے۔آخر میں کہنے لگے ''سو یو آر آ رائیٹر''۔ میں ان کی شکل دیکھتی رہ گئی کیونکہ رائٹر تو وہ خود تھے کئی کتابوں کے! سیشن ختم ہونے کے بعد بھی وہ مجھ سے بتول کے بارے میں مزید باتیں کرتے رہے۔اس کے بعد لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور بڑے امپریس ہوکر سوالات کرتے رہے۔عربی اور ایرانی ساتھیوں کو کچھ سمجھ آیا اور

انہوں نے ویب سائٹ پر بتول اور میرے نام کو پڑھا بھی۔ پھر یہ ہوا کہ بتول میرا انٹروڈکشن بن گیا۔ مجھے شرم بھی آتی کہ جیسے میں شوآف کر رہی ہوں لیکن ساتھیوں کے انداز سے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی ہی ہوئی ہے۔ میرے سپروائزر تک بات پہنچی انہوں نے کہا۔ ''آئی نیور نیو دیٹ یو آر آ رائیٹر'' اور میں خاموش رہی۔ گھر آ کر میں دل ہی دل میں بتول کا شکریہ ادا کرتی رہی جس نے ایک پاکستانی اسٹوڈنٹ کی عزت بڑھائی۔ اس احساسِ تشکر کے ساتھ ہی میں بتول کے ساتھ اپنے تعلق کا سوچنے لگی۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے میری ایک ساتھی نادیہ ایوب نے کچھ سال پہلے (۱۱۰۲) مجھے بتول دیتے ہوئے کہا کہ یہ ایک اچھا میگزین ہے پڑھنے میں بہت مزہ آئے گا۔ میں نے لے لیا ایک نظر دیکھا اور سائیڈ پر رکھ دیا یہ سوچتے ہوئے کہ دو چار دن بعد اسے واپس کر دونگی کیونکہ مجھے اس میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ بہت سادہ سا میگزین تھا نہ لڑکیوں کی خوبصورت تصویروں سے سجا۔ نہ ہی فیشن کا پرچار کرتا بلکہ میں نے تو اسے پہلے کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ ایک دن اکیلی تھی، ٹی وی دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ سامنے بتول رکھا نظر آیا اسے ہی پڑھنے لگ گئی۔ وہ ''حمیدہ بیگم نمبر'' تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ سب سے پہلے جو مضمون پڑھا وہ فرات غضنفر کا مضمون ''ہے ناں امی'' تھا۔ پڑھتے ہوئے میرا دل بھر آیا اور میں روئے بنا نہ رہ سکی۔ میں نے اس پورے میگزین کو پڑھ لیا اور نادیہ سے کچھ اور میگزین لے لئے۔ نادیہ نے میرا شوق دیکھ کر مجھے آنٹی الف خ رعنا سے ان کے گھر درس پر ملوایا۔ آنٹی بہت محبت سے ملیں مجھے کچھ اور میگزین پڑھنے کو دیئے۔ میں نے انہیں پڑھا اور فون پر کچھ مضامین پر تبصرہ کیا۔ انہیں بہت اچھا لگا کہنے لگیں ''تم سالانہ میگزین لگوالو۔ گھر بیٹھے ہر ماہ کا بتول پڑھ لینا''۔ پھر انتہائی اپنائیت سے کہنے لگیں۔ ''اگر تم چاہو تو میں لگوا دوں'' میں نے فوراً حامی بھر لی اور پھر بتول میرے گھر آنے لگا۔ اس کے بعد فون پر آنٹی سے بتول پر تبصرہ کرنا میری عادت بن گیا۔ وہ اکثر کہتیں ''تم لکھتی کیوں نہیں ہو''۔ میرا ایک ہی جواب ہوتا کہ مجھے لکھنا نہیں آتا وہ محبت سے کہتیں ''تبصرہ ہی لکھ بھیجو''۔ اور پھر میں نے لکھنے کی ٹھانی۔

میرا پہلا مضمون تیار ہوا تو ہمت کر کے بھیج دیا۔ ایک دن محترمہ صائمہ اسما صاحبہ کا فون آیا میرے مضمون کے بارے میں کچھ بات کی۔ میرے معلوم کرنے پر کہنے لگیں کہ جلد ہی چھپ جائے گا۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ بے چینی سے انتظار کرنے لگی اور جلد ہی میرا مضمون چھپ کر آ گیا۔ میں نے کسی سے ذکر نہ کیا تھا کہ نہ چھپنے کی صورت میں شرمندگی سے بچ سکوں۔ سب سے پہلے آنٹی کا مبارک بادی کا فون آیا اور اس کے بعد وہ اکثر پوچھتیں کہ اگلا مضمون کب آ رہا ہے؟

میں سمجھتی ہوں کہ لکھنا شروع کرنے کے لئے کسی بھی میگزین کے اڈیٹر اور دوسری لکھاری ساتھیوں کی طرف سے حوصلہ افزائی بہت اہم رول ادا کرتی ہے اور میں دونوں میں خوش قسمت رہی۔ ایک مضمون لکھنے کے بعد تو جیسے مزہ ہی پڑ گیا۔ بتول پڑھنا اور اس میں لکھنا میرا شوق بن گیا۔ پھر میں یہ کیسے کہہ سکتی ہوں کہ ''بتول میں چلتے پھرتے پڑھ لیتی ہوں''۔ بلکہ مجھے کہنا چاہئے کہ بتول تو دیارِ غیر میں میرے لئے واحد بہترین دوست ہے۔ شکریہ بتول۔

☆☆☆

محشر خیال

افشاں نوید۔ کراچی

ز ہے نصیب کہ بتول جنوری کے پہلے ہفتے میں ہاتھ آ گیا اس لئے تبصرہ حق بنتا ہے۔

تبصرے سے مراد محض یہ بھی نہیں کہ ہر تحریر سے لیا ہوا سبق بیان کیا جائے یا فرداً فرداً ہر تحریر پر تبصرہ کیا جائے ، بلکہ ساتھ ساتھ رسالے کے معیار کو بہتر بنانے کی تجاویز و مشورے بھی شامل ہوں۔ ''بتول'' سے تعلق کی وجہ اس کے نظریے کی لگن ہے اور اپنی چیز اچھی لگتی ہے لیکن اگر اپنے ارادوں کا حال دیکھیں تو نہ وہ ٹیکنالوجی نہ وہ وسائل نہ افرادی قوت اور ہمارے بالمقابل جو نظام ہے ان کے پاس بہترین وسائل اور جدید ترین ٹیکنالوجی ۔ بقول ڈاکٹر انیس احمد '' اہل حق اپنا پیغام اخباری پیپر پر پہنچاتے ہیں اور دوسرا بالمقابل پیغام بٹر پیپر پر پہنچتا ہے تو لوگ کس کی طرف متوجہ ہونگے ؟'' بتول کے لکھاریوں پر بات کرتی ہوں مگر پہلے بتول کے معیار پر بات۔

بتول کا ادارہ وسیع ذہنی افق کی عکاسی کرتا ہے۔ اچھا ہو کہ بتول کے سائز پر نظر ثانی کی جائے اور اردو ڈائجسٹ وغیرہ کے سائز پر لائیں کیونکہ اس وقت خواتین کے رسائل اسی سائز کے چھپتے ہیں اور جاذب نظر ہوتے ہیں۔ بتول کے ٹائٹل پر توجہ کی ضرورت ہے۔ اکثر کسی کلینڈر کا صفحہ لگتا ہے اس وقت اس حوالے سے نیٹ کی دنیا میں اتنا کچھ دستیاب ہے بس ضرورت ہے آئیڈیاز پر کام کرنے ، ٹیم ورک کو مستحکم کرنے ، وسائل مہیا کرنے اور دستیاب وسائل کے بہتر استعمال کی (جو یقیناً ہر ادارہ سوچتا ہے)۔ بتول کے اشتہارات بڑھانے کی ضرورت ہے ۔ اشتہاروں کا انداز بھی تبدیل کرنے کی ضرورت ہے ۔ کس طرح کی تبدیلی؟ یہ دیگر رسائل دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے۔ پیپر اچھا اور صفحات رنگین بتول کی تحریروں میں مقصدیت ہوتی ہے مگر اکثر لکھنے والے ایک خاص ذہنی سانچے سے باہر نہیں نکل پاتے ۔ مثلاً ہم یہی سمجھتے ہیں کہ پردہ ، بے حیائی ، مخلوط محافل ہی معاشرے کا سب سے بڑا چیلنج ہیں۔ اس وقت ٹی وی چینلوں اور نیٹ پر جس حساب سے لوگوں کو'' زیست برائے خوردن'' کی طرف لایا جا رہا ہے کیا آپ کے خیال میں یہ بے حیائی سے بڑا فتنہ نہیں ہے؟ صرف کھانا ، کھانا بس کھانا ۔ دو دوست ملتے ہیں کہیں کھانے پر چلیں ، خاندان ملتے ہیں تو کھانے پر چلیں ، تقریبات ہیں تو کھانے میں وارئٹی کیا ہے؟ اب سڑکوں پر کھانے ، فوڈ اسٹریٹ کی بڑھتی ہوئی اور لائبریریوں کی گھٹتی ہوئی تعداد شکم کا بندہ بن کر ہماری روح بھی ہمارے جسم کا حصہ بن گئی پھر سوشل میڈیا کا جن ہمارے بچے ہمارے گھروں میں موجود مگر اغوا کا شکار ہو چکے ہیں ۔ اب ان نئے چیلنجوں کے لئے آج کا ادیب کیا سوچتا ہے ، لکھاری کیا کر رہا ہے۔ بتول اپنے لکھنے اور پڑھنے والوں کی رہنمائی کرے۔ عالمی سطح کے اچھے ادیبوں ، پاکستان کی پچھلی نسل کے بڑے ادیبوں کی نگارشات گاہے گاہے پیش کی جائیں کہ اچھا لکھنے کے لئے اچھا پڑھنا شرط ہوتا ہے ۔ جو ادبی نوبل انعام یافتہ مصنفین ہوتے ہیں ہر برس ادب کے شعبے میں کبھی انکا تعارف ان کی کوئی تحریر۔ ہندو پاک کے معیاری ادبی رسالوں کا کوئی تعارف۔ جو اعلیٰ عالمی معیار کے مجلّے شائع ہوتے ہیں ان سے تحریروں کا انتخاب۔ ٹیکنالوجی کا کمال ہے کہ فی زمانہ ایک کلک پر یہ سب دستیاب ہے ۔ شاعری کا انتخاب (اس وقت ہندوستان میں بہت اچھی اردو شاعری کی جا رہی ہے)

اب آیئے ماہ جنوری کے شمارے کی طرف۔

الحمدللہ محنت کی جاتی ہے تب ہی لوگ رسالہ خریدتے ہیں۔ معیار

کے حساب سے سہ ماہی فنون سے جو انتخاب پیش کیا گیا وہ اعلیٰ ترین تھا۔ ایک بہترین ادیب کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کا پیغام بین السطور ہوتا ہے اور بہت گہرا اور دیرپا تاثر چھوڑتا ہے (ہم بڑے ادیبوں کو بہت کم پڑھتے ہیں) دوسری تحریر محمد صفدر بشیر کی انتہائی عمدہ تحریر ہے کچھ لوگوں کو اللہ نے لفظوں کا ذوق بہت وافر عطا فرمایا ہے۔ لفظوں سے اتنی عمدہ اٹھکیلیاں کہ لفظ بھی ہنس پڑے اور قاری نے بھی گدگدی محسوس کی لفظوں کی۔

دنیا سے گزرنے والوں کے لئے جو تبصرے ہوتے ہیں، آپ نے کسی سابقہ شمارے میں اس طرف توجہ بھی دلائی تھی کہ سب ایک جیسے ہوتے ہیں اور وجہ ظاہر کی کہ ہم ان ہستیوں کے احسانات کے بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں اور اپنے ماں باپ سب کو ایک جیسے لگتے ہیں اور واقعی ہوتے ہیں مگر..... میں سوچتی ہوں کہ کسی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ہم اس کے مرنے کا انتظار کیوں کرتے ہیں؟ لگتا ہے چار سو اندھیرا شائد اسی لئے ہے کہ ہم نے سب چراغ مٹی میں رکھ دیئے ہیں! کوئی ایسا سلسلہ شروع کریں صائمہ کہ ہم اپنے زندوں کی قدر کرنا سیکھیں۔ ان کو خراج عقیدت پیش کریں۔ جب قاضی حسین احمد مرحوم کے گذر جانے کے بعد عالمی لیڈروں اور ملک بھر کے اخبارات اور جرائد نے ان کو خراج عقیدت پیش کیا تو ایک صحافی نے لکھا کہ ''کیسی بدنصیب تھی پاکستانی قوم کہ اسے انکے مرنے کے بعد پتہ چلا کہ ان کے پاس ایسا مرد درویش تھا۔''

نیویارک میں چند روز'' بڑا چونکانے والا مضمون ہے۔ ہر دیکھنے والی آنکھ ایک جیسی ہوتی ہے مگر اس کے پیچھے سوچنے والا دماغ مختلف۔ ایک صاحب ایمان حالات و واقعات کو کس نظر سے دیکھتا ہے، بہترین شیئرنگ اس تحریر میں، گھر بیٹھے نیویارک کی سیر ہوگئی اور عبرت کی عبرت!

اچھا ہوتا کہ اشاریہ کا فونٹ چھوٹا ہوتا، بس دو ہی صفحے کافی تھے۔ حبیب الرحمٰن کی شاعری میں بہت سوز و گداز ہے۔ عافیہ رحمت کی تحریر میں بڑی بے ساختگی نظر آئی، بہت عمدہ رہی آپ کے مستقل لکھنے والے پختہ ہیں یا ہو گئے ہیں ماشا اللہ۔ شمیم فاطمہ، ام ایمان، قانتہ رابعہ، آسیہ راشد، فرحت طاہر، بشریٰ تسنیم، نجمہ یاسمین، عصمت اسامہ، شگفتہ نقوی، اللہ ان سب کو شاد رکھے اور انکے قلم کو رواں (یہاں کسی کا نام رہ گیا ہو تو معذرت خواہ ہوں)۔

راحیل قاضی کا خط پڑھ کر سوچا کہ اور ''بہت کچھ'' کے ساتھ شاعری بھی کر سکتی تھیں۔ اس طرف توجہ کیوں نہ کی؟ فرحت طاہر تھوڑا سا زیادہ حساس ہو جاتی ہیں۔ قارئین ان کے بارے میں ایسا نہیں سوچتے جس کا اظہار وہ دو خطوط میں کر چکی ہیں۔ ان کی تحریروں میں بڑی پختگی اور نیا پن ہوتا ہے جو انکا قلم سے مضبوط رشتہ ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ ''تحریر گمنام نہیں ہو سکتی کہ اس پیشے کا تقاضہ ہی یہ ہے'' فرحت ڈیئر ادب کب پیشہ تھا؟ ادیب تو کسی پیشے کا نام نہیں اس سماج میں اور جب ادب کو پیشہ بنایا گیا تو فتنہ وہیں سے شروع ہوا، حاذق الخیری کے عنوان سے جو کچھ انہوں نے لکھا اس کو کسی نشست، کسی سیمینار، کسی مذاکرے کا عنوان ہونا چاہیے۔ سو بار سوچا جانے والا عنوان ہے۔ فرحت کی یہ بات کہ ''تبدیلی پیوند کی طرح لگی محسوس نہ ہو'' سرورق پر چھاپے جانے کے قابل ہے۔ بے شک ہماری نسل نے ہجری اور عیسوی صدی کو حالت شعور میں بدلتے دیکھتا ہے۔ جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے تو پی ٹی وی کے اس ترانے کی گونج سے در و دیوار گونجتے تھے کہ ''اب کے نئی صدی کا اجالا جو آئے گا اور ہم بھی دن بھر لپک لپک کر گاتے تھے کبھی اسکول کی سہیلیوں کے ساتھ تو کبھی بہن بھائیوں کے ساتھ اللہ کی زمین پہ اندھیرا نہ چھائے گا ایسی ہر ایک صبح ہر شام زندہ باد اسلام زندہ باد'' اور ہم نے دیکھا کہ اس کے برعکس صدی ہجری میں اسلام غریب اور تنہا ہوتا گیا اور ہمیں ہماری خوش حالیوں نے ڈس لیا۔ 9/11 کے ناگ نے تو بہت کچھ ڈس لیا۔ ہزاروں مسلمانوں کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل آئی۔ وہ سمندروں میں پناہ گزین ہیں اس وقت برمی اور شامی مسلمان، مصر یا فلسطین، افغانستان یا کشمیر ہر طرف خون مسلم کی ہولی ہے۔ تاریخ کے اس سفر میں ہمارا کردار آنے والا مورخ کن لفظوں میں لکھے گا، واقعی سوچا جانے والا عنوان ہے۔

صائمہ! میرا گمان ہے کہ اتنا طویل تبصرہ پڑھ کر آپ کہیں گی کہ

اچھا ہو کہ آپ سالانہ ہی اپنا تبصرہ بھیجا کریں!

قلم کی مجاہد بہنوں کو مخلصانہ سلام اودعائیں ۔آپ کے حق و صداقت کے لئے لکھے ہوئے لفظ ان شاءاللہ روز حشر شہیدوں کے خون کے برابر معتبر ٹھہریں گے ۔اچھا ہو کہ سہ ماہی میں ایک بار ثریا اسماء، خالہ جان بھی بتول کی بزم میں جگمگائیں ۔ان کی ادارتی کاوشوں پر رب انہیں اپنی رحمت سے ڈھانپ لے ۔آمین

☆ایسا تبصرہ ہر ماہ ملے تو کیا ہی کہنے! (ص۔ا)

☆.....☆.....☆

نجمہ یاسمین یوسف ۔لاہور

مبارک باد کہ پچھلے کئی ماہ سے مہینے کے شروع تاریخوں ہی میں پابندی کے ساتھ ماہنامہ بتول نظر نواز ہو رہا ہے ۔نومبر اور دسمبر کے شماروں میں محترمہ فرحت طاہر اور محترمہ قانتہ رابعہ کی تحاریر نے بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور کر دیا

دیکھنا تقریر کی لذت کو جو اسنے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ہمیں تو جمود سستی بیماری نے نکما کر دیا، ورنہ ''ہم بھی آدمی تھے کام کے''، بس اس خوش فہمی سے کام چل رہا ہے مگر محترمہ فرحت کے قلم نے نشتر بن کے فاسد مواد کو بہنے پر مجبور کر دیا اور کپکپاتے ہاتھوں سے قلم پکڑ لیا ہے۔

''بتول'' کھولتے ہی ابتداء تیرے نام سے ہوتی ہے اور خوب ہوتی ہے موضوع گرفت حالت حاضرہ پر تبصرہ اور علاجِ بے کساں قاری کو پوری طرح منہمک رکھتے ہیں پھر ''انوارِ ربانی'' سے منور تحاریر تمام اہل قلم کے لئے نیک تمناؤں کا باعث ہیں ۔قول نبیؐ سے بہرہ مند کرانے والے صاحبِ علم لوگوں کو ہم سب کا خصوصی سلام ۔فہرست طویل اور ہمت مختصر ہے ۔بتول میں تمام لکھنے والے نہایت پختہ کار عصر حاضر سے باخبر اور دین وملت سے آگہی رکھنے والے اور آج کے تقاضوں سے ہم آہنگی کی ضرورت سے آشنا ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ بتول ہر طرح کے طبقے میں مقبول ہوتا جا رہا ہے ۔لادینی، بے جا رسم و روایات کو رد کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کر رہا ہے ۔''نیو یارک میں چند روز'' یو این کانفرنس کا ایجنڈا برائے نسواں'' میں محترمہ صائمہ اسماء نے اکیلے شرکت نہیں کی سب پڑھنے والوں کو اپنے ساتھ لیے لیے چلتی رہیں ۔انداز تحریر ہلکا پھلکا اور منفرد ہونے کی وجہ سے بہت اچھا لگا۔

ذاتیات سے بالا صحت مند تنقید کسی بھی فن پارے کو شاہکار بنانے کا انتہائی موثر اور ضروری ذریعہ ہے اس لئے اس کا کھلے دل و ذہن سے خیر مقدم کرنا چاہیے ۔فرحت صاحبہ اور قانتہ رابعہ صاحبہ کی تجویز کہ بتول کا ساٹھ سالہ جشن منانے کے لئے مزید انتظار کی بجائے بسم اللہ کر دینی چاہیے ۔مثل مشہور ہے ''ساٹھا پاٹھا'' تو جب عین عالم شباب کا دور ہو پھر دیر کیوں؟

بہت سوچا کہ محترمہ فرحت اور محترمہ قانتہ رابعہ کی نذر اور تمام لکھنے والوں کے لئے کچھ مختصر اشعار کہیں سے مل جائیں جو نا قدرئ ہنر کا مداوا کر سکیں سو ایک مختصر نظم سمجھ میں آئی جو بھیج رہی ہوں اس خط کے ساتھ۔

کیسے جاگیں!

علم و ادب کے رنگ محل میں
جتنے لوگ بھی ہوتے ہیں
کرنوں کی تخلیق کی خاطر
درد کے پتھر ڈھوتے ہیں
اجلی اجلی تحریروں سے
داغ جہالت دھوتے ہیں
دیتا ہے دستک اجیالا
ذہن کے بند کواڑوں پر
کیسے جاگیں وہ جو انا کے
تنگ دروں میں سوتے ہیں!

☆ اہل بتول کے لئے آپ کی اس قدر افزائی اور خوبصورت اشعار پر ہم تہہ دل سے آپ کے ممنون ہیں (ص۔ا)

☆.....☆.....☆

کرامت بخاری

پرچہ حسب روایت خوب ہے اسے خوب تر بناتے رہیے، رک جانا یا مطمئن ہو جانا کہ اب بہت کام ہو گیا، سفر کو روک دیتا ہے، خوب سے خوب کی تلاش جاری رہنی چاہیے۔

حق، سچ، ایمانداری، عفو و درگزر، طمانیت، آسودگی، رواداری، بردباری، وضعداری، قناعت، صبر، دوسروں کی مدد، خدمتِ خلق، ہمدردی، سینہ بے سینہ، آنکھوں میں شرم، طبیعت میں نرمی، رحمدلی، بچوں سے شفقت، والدین کا احترام، بزرگوں کی خدمت، ملک و قوم کی ترقی اور برائی سے نفرت جیسے عوامل ہمارے دین کا حصہ ہیں، انہیں دہراتے رہیے یاد دلاتے رہیے، سیکھتے سکھاتے رہیے پھیلاتے رہیے، سمجھتے سمجھاتے رہیے اور خود عمل کر کے دکھاتے رہیے۔

☆.....☆.....☆

کرن وسیم۔ کراچی

میں بتول کی بہت پرانی قاری ہوں۔ آپ کا ماہنامہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں مگر قلم اٹھانے کا یہ پہلا موقع ہے۔ ماہنامہ بتول بلاشبہ ایک بہترین رسالہ ہے جو خواتین بالخصوص نوجوان لڑکیوں کے ساتھ ساتھ مرد حضرات کے لئے بھی ذہنی اور فکری اصلاح کا کام بہترین طریقے سے انجام دے رہا ہے۔ جس کے لئے آپ کی پوری ٹیم دعاؤں اور حوصلہ افزائی کی حقدار ہے۔

ویسے تو آپ کا ہر شمارہ ہی آپ کے ادبی مقاصد کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے مگر نومبر کے شمارے میں قانتہ رابعہ کے افسانے ''غیرت ہے بڑی چیز'' نے تو مجھ کو حقیقتاً قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ میں بہت عرصے سے شادی بیاہ اور تقریبات وغیرہ میں فوٹو گرافی اور مووی کی شکل میں بے پردگی کا مشاہدہ کر رہی ہوں مگر ہم مصلحت کے شکار لوگ صرف دل میں برا جاننے کے سب سے کم ایمانی درجے پر ہی جمے رہتے ہیں۔ اس تحریر کی اثر انگیزی سے امید ہے کہ سوچ اور عمل کے زاویوں میں تبدیلی آجائے۔

☆.....☆.....☆

مریم فاروقی۔ لاہور

بتول اور اس کی ٹیم کے لئے قدم قدم پر دعائیں نکلتی ہیں اللہ آپ کو شاد و آباد سلامت رکھے اتنی محنت سے اتنا شاندار اور جاندار جریدہ نکال رہے ہیں۔ مجھے بھی اللہ توفیق دے کہ اس کو آگے تک پھیلاؤں۔ گزشتہ مہینوں میں غزالہ ارشد امریکہ کا سفر نامہ بھی بہت دلچسپ تھا۔ ہماری تو امریکہ کی سیر ہو گئی مفت میں۔ اب اکتوبر میں انڈیا کا سفر نامہ شروع ہوا ہے بہت دلچسپ اور اچھا لگا۔ مجھے بھی تاریخ سے گہری دلچسپی ہے واقعی بات ٹھیک ہے کہ مسلمانوں نے نفع بخش علوم و فنون کے فروغ میں وہ کوشش نہیں کی جس طرح کرنے کا حق تھا اس لئے ہم زوال کا شکار ہوئے حالانکہ رسول پاکؐ نے تو ہمیں وہ دعائیں سکھائی ہیں جو ہمارا مقصد زندگی بھی بتاتی ہیں اور عمل کے لئے راہیں بھی متعین کرتی ہیں جیسے:

''اے اللہ! ہمیں نفع دے جو تو ہمیں سکھائے اور ہمیں وہ سکھا جو ہمیں فائدہ دے۔'' یعنی ایسے علوم جس کے لئے ہم روحانی اور معاشرتی طور پر مطمئن اور پرسکون بھی ہوں اور ہماری زندگی سب کے لئے فائدہ مند بھی ہو۔ سبھی سلسلے دلوں کو موہ لینے والے ہیں اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

☆.....☆.....☆

خورشید بیگم۔ گوجرہ

خزاں کا منظر پیش کرتے ہوئے خوبصورت سرورق کے ساتھ ماہنامہ بتول میرے ہاتھ میں ہے اور مجھے لگتا ہے اس پر تبصرہ لکھنا اس کا حق بنتا ہے۔ سب سے پہلے تو اداریہ ہی قابل توجہ ہے۔ کیسا دردمند دل پایا ہے بہن صائمہ اسما صاحبہ آپ نے۔ کاش ہر پاکستانی کو ایسا دل عطا ہو جائے۔ کیسی تلخ حقیقت کو بے نقاب کیا آپ نے۔ واقعی گزرنے والے سال میں انسانیت اور زوال آشنا ہوئی اور شیطانیت اور پھلی پھولی۔

قول نبیؐ مسلمانوں کے باہم تعلقات کے بارے میں رہنمائی ہے جو ایک مضبوط اور صالح معاشرہ کی بنیاد ہے (خاص مضمون) پروفیسر محمد اکرام طاہر صاحب بڑے موثر طریقے سے ہمیں ''رزقِ حلال عین

عبادت ہے'' کا درس دیتے ہیں ۔ بہت خوب ربیعہ ندرت صاحبہ نے گواہی کے عنوان کے تحت بڑے پیارے سبق سکھائے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ آمین

''زمین پر قدم'' بہن قانتہ رابعہ حسبِ معمول باتوں باتوں میں سبق سکھا گئیں'' اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ رہنے میں کچھ فائدے اور کچھ نقصانات رکھے ہیں ۔ پھر آہِ حسرت کیسی؟

رخسانہ اقبال صاحبہ نے''اپنا اپنا امتحان''عنوان کے تحت کیسا نادر سبق دیا''کسی کو کم اور کسی کو زیادہ، کسی کو شکل اور کسی کو سہولت دے کر۔ اللہ نے آزمایا تو سب ہی کو ہے۔ اپنا اپنا امتحان ہم سب نے اپنی اپنی جگہ پاس کرنا ہے۔''

''بسو کی ماں'' دلشاد نسیم صاحبہ کی کہانی بڑے موثر انداز میں سبق دے گئی کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں امیر و غریب دونوں برابر ہیں ۔

'' آؤ زندگی کا نصاب بدلیں'' افشاں نوید صاحبہ کی نہاں خانۂ دل سے نکلی تحریر نہاں خانۂ دل میں اتر گئی ۔ ڈاکٹر بشریٰ تسنیم صاحبہ واقعی ام المؤمنین حضرت خدیجہ طاہرہ خاتونِ اول ہیں ۔ یہ اعزاز کسی اور کو دینا یقیناً بہت بڑی غلطی ہے۔

بہن آسیہ راشد صاحبہ کی محنت قابل تحسین ہے اور مفید بھی ۔ کئی اور مختصر مگر موثر تحریریں اس دفعہ ماہنامہ بتول کا حصہ ہیں ۔ اللہ کریم سب لکھنے والوں پر اپنا لطف و رحم قائم رکھے ۔ (آمین)

ماہنامہ بتول اور ادارہ بتول کی ترقی و کامیابی کے لئے دعاؤں کیساتھ

☆ عذبہ حنیف (شرقپور) آپ نے افسانے کا جو انتخاب بھیجا ہے اس پر افسانہ نگار کا نام اور کتاب کا حوالہ موجود نہیں ہے۔ یہ اگر آپ لکھ کر بھیج دیں تو شائع ہو جائے گا۔

☆.....☆.....☆

بتول میگزین

میرا رب مجھے حیران کر دیتا ہے

نازیہ خان۔شیفیلڈ

کبھی کبھی انسان کی زندگی میں ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ایسا ہی ایک واقعہ میرے ساتھ بھی پیش آیا۔ سوچا کیوں نہ آپ سب کو بھی سنایا جائے۔

ابھی کچھ دن پہلے ہی میں نے ایک والنٹیر ڈائیشن کی حیثیت سے ناردن جنرل ہاسپٹل میں کام شروع کیا ہے۔ایک دن ڈیوٹی پر جانے لگی تو خان (شوہر) نے کہا میں اسی طرف جا رہا ہوں تمہیں چھوڑتا جاؤں گا۔میں چل پڑی کیونکہ دیر ہو رہی تھی۔کام ختم کر کے جب میں ہاسپٹل سے باہر آئی تو خیال آیا کہ گاڑی تو لائی نہیں ہوں لہذا بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔سردی خوب تھی اور بارش بھی شروع ہو چکی تھی میں نے پرس میں ہاتھ ڈال کر کرائے کے پیسے چیک کئے تا کہ بس میں مشکل نہ ہو۔یہ کیا.....میرا والٹ تو گھر رہ گیا تھا۔اب کیا کروں خان کو فون کیا مگر جواب نہ ملا۔اتنی تیز بارش اور سردی میں پیدل اتنی دور جانے کا سوچ کر ہی گھبرا گئی۔ایک بلڈنگ کے سائے تلے کھڑے ہو کر سوچتی رہی کہ کیا کروں۔آخر اللہ سے دعا کرنے لگی کہ کچھ سبب پیدا کر۔ابھی میری دعا پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ سامنے سے گزرتی گاڑی پر نظریں جم گئیں۔ایسا لگا کہ گاڑی جانی پہچانی ہے۔تھوڑی دیر بعد میں نے گاڑی کو واپس آتے دیکھا شاید پارکنگ فل ہونے کے باعث ڈرائیور کہیں اور جگہ ڈھونڈنے کے لئے واپس آیا تھا۔میں نے فوراً گاڑی کو ہاتھ دے کر روکا کیونکہ میرا دیور اس میں بیٹھا تھا۔وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔اپنے رب کی اس عطا پر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اتنی سردی اور بارش میں اس نے مجھے سڑک پر چلنے سے بچا لیا۔میرا دیور میرے گھر سے کافی دور رہتا ہے۔اور پچھلے کئی سالوں میں کبھی بھی اس کا اور میرا آمنا سامنا اس طرح نہ ہوا تھا لیکن اس دن اسے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر میری مدد کے لئے بھیجا تھا جب میں نے یاسر (دیور) کو پورا واقعہ سنایا تو وہ بھی حیران رہ گیا۔اسی لمحے مجھے قرآن کی یہ آیات یاد آ گئیں۔

''اور جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو پاس ہوں۔جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں تو ان کو چاہیئے کہ میرے حکموں کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تا کہ نیک رستہ پائیں''۔(البقرہ:۱۸۶)۔

☆.....☆.....☆

فاطمہ رعنا سے!

فریدہ ابوبکر۔کراچی

عرصے سے بتول کی قاریہ ہوں۔پہلے کچھ کاغذ قلم سے ربط رہا۔اب اپنی عزیز از جان بہن و ساتھی فاطمہ رعنا کے عزیز بیٹے کے انتقال پرسوز پرجدہ سے بہن سیما ملک کا مضمون پڑھنے کو ملا۔پیاری سیما جزاک اللہ خیر..... انتہائی جامع، مختصر، بھرپور ..... غمزدہ محبت بھرا پیغام .....نمناک آنکھوں سے پڑھتی جا رہی تھی پھر کھانے کی میز پر اپنے بچوں اور نواسوں، نواسیوں کو سنایا.....دل میں اتر جانے والی تحریر۔میری جان فاطمہ! تم سے بات کرنے کو ترس گئی ہوں۔اس لئے سوچا کہ ''بتول'' ہی کے ذریعے اپنے بیٹے کی کچھ یادیں بانٹ لوں۔

مجھے وہ ننھا سا احمد ہمیشہ یاد رہتا ہے!''عقربیہ'' میں تمہارے گھر پر ہم دونوں کام میں مصروف تھے کہ احمد جانو آیا اور اپنی ماں کے کان کے چھوٹے جھمکے چھوتے ہوئے بڑے پیار سے کہہ رہا ہے ''امی آپ کتنی اچھی لگ رہی ہیں'' اور میں اس ننھے بچے کا معصوم اور خوبصورت چہرہ ہی تکتی رہی۔

فاطمہ جانو، علیم بھائی اور احمد، انس کے لئے اللہ رب العزت نے

ہمارے اور بچوں کے دلوں میں بڑا خوبصورت تعلق پیدا کر دیا ہے۔ جبھی یہ حادثہ ہمارے پورے گھر کو ہلا گیا۔

دمام میں ایک بار فاطمہ کے ہاں دن رات کا قیام تھا دونوں بچے بار بار اپنی دلی خوشی سے فریدہ خالہ کے قیام پر اظہار محبت کئے جا رہے تھے۔ آ کر بیٹھتے باتیں شیئر کرتے.....واقعی سیمانے سچ کہا فون پر سب کی خیرت معلوم کرنے کے بعد، اطمینان سے ماں کو فون تھماتے۔

احمد بیٹے ! آپ کے ساتھ کی خوبصورت میٹھی یادیں آپ کی ابدی زندگی کے لئے دعاؤں کی صورت ڈھل گئی ہیں..... یارب ہمارے بیٹے کو جنت کے نوجوانوں کے سردار امام حسنؓ و حسینؓ کا ساتھ نصیب فرمانا آمین۔

فاطمہ جانو! آپ تینوں کے لئے رضائے رب، قلبی سکون و راحت اور رسولِ رحمتؐ کے مشن پر تا زندگی استقامت کے ساتھ چلنے اور خاتون جنت سیدہ فاطمہؓ اور محمدؐ کا پڑوس بننا نصیب فرمانا۔ آمین یا رب العالمین۔

☆.....☆.....☆

کھول آنکھ، زمیں دیکھ

نسیم الٰہی۔ جھنگ

زندگی کا سفر بھی عجیب ہے، چھوٹی چھوٹی خوشیاں انسان کو خوش گوار احساس دلاتی رہتی ہیں۔ سپاٹ سے انداز میں دن گزرتے جائیں تو زندگی بے مزہ ہو جاتی ہے۔ جب کہ تبدیلی آب و ہوا انسان کی فطرت پر بہت خوشگوار اثرات مرتب کرتی ہے۔ شاید اسی لئے سفر کو وسیلہِ ظفر قرار دیا گیا ہے۔ یوں تو ہم زندگی میں کئی سفر کرتے ہیں مگر کوئی ایک سفر یا واقعہ ہمارے ذہنوں پر انمٹ نقوش چھوڑ جاتا ہے۔

میری زندگی کا بھی ایک سفر ایسا ہے جو میرے ذہن میں نا قابلِ فراموش بن کر سمایا ہوا ہے۔ ہم نے اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنے عزیز و اقارب سے ملنے کے لئے نہنگ سے پٹاٹ کوٹ جانے کا پروگرام بنایا۔ یقیناً اس سفر میں رشتہ داروں سے ملنا تو خوشی کا باعث تھا لیکن ہمیں زیادہ خوشی ان مناظر کا تصور کر کے ہو رہی تھی جن سے ہمیں اس سفر میں لطف انداز ہونا تھا۔ بہر حال تمام ضروری تیاریوں کے بعد اللہ کا نام لے کر سفر شروع ہوا۔ آغاز پر ہی راستے میں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے نظر آنے لگے، یہ ٹیلے ریتیلے علاقوں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہ اتنے ویران لگتے ہیں کہ جیسے خاموشی کی زبان میں اپنے دکھ اور غم کی داستان سنا رہے ہیں۔

ٹیلے پار کرتے ہوئے، ایک گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد ہماری گاڑی ایک فوجی چھاؤنی کے قریب جا کر رک گئی۔ بھیڑ اور گاڑیوں کے ہجوم کی وجہ سے ہمیں تھوڑی دیر رکنا پڑا۔ فوجی چھاؤنی میں پاکستان کے بہادر سپوت اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھے۔

میرے بھائی جان اس چھاؤنی میں موجود ساز و سامان سے متعلق ہمیں آگاہ کرتے رہے۔ پھر ہماری گاڑی آہستہ آہستہ فوجی چھاؤنی سے آگے کے سفر پر روانہ ہوئی۔ چھاؤنی کے اردگرد لمبے لمبے صنوبر کے درخت نہایت بھلے لگ رہے تھے۔ اس دوران میری اور بھائی جان کی گفتگو جاری تھی، اور وہ تو جیسے معلومات کا خزانہ تھے۔ جہاں ہم ان خوبصورت فضاؤں میں گم تھے وہیں امی اور خالہ جان اپنی دنیا میں مگن اپنے مسائل پر بات چیت کر رہی تھیں۔

اسی طرح سفر کرتے ہوئے ہمیں تقریباً آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ اب ہم ایک ایسی نہر پر موجود تھے جس پر ایک چھوٹا سا پل بنا ہوا تھا۔ اس پر سے گزرتے ہوئے نہر کا حسین نظارا دیدنی تھا۔ اس نہر سے آگے ہر طرف سبزہ ہی سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ ہلکی پھلکی بارش کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ آثار سے ایسا لگتا تھا کہ بارش تیز ہو جائے گی۔ ہم ہر طرف پھیلی ہوئی قدرت کی نشانیاں دیکھ کر اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے آدھے گھنٹے کے بعد دریا کے کنارے پر پہنچ گئے تھے جہاں لوگ کشتی کی سیر میں مصروف تھے۔ ہم نے بھی ایک کشتی میں سوار ہو کر دریا کی سیر کی۔ اس دوران رنگ برنگی مچھلیاں پانی کی سطح پر نمودار ہوتی رہیں جن کو دیکھ کر دل و دماغ قدرت کی کاریگری پر حیران تھے۔ پانی کو دیکھ کر یہ خیال بار بار ذہن میں آ رہا تھا کہ یہ اللہ کی کیسی نعمت ہے کہ اگر بارش کی صورت

میں ہوتو فصلوں کی آبیاری کرے، اگر سیلاب کی صورت ہوتو انہی فصلوں کی تباہی بن جائے ،ایسے میں رب کائنات کا وہ فرمان ذہن پر دستک دے رہا تھا کہ ''میں نے ہی پانی پیدا کیا ،اور تمہارے تنکے جیسے جہاز (اور کشتیاں) اتنے بڑے سمندمیں کیسے چلتے ہیں۔''

کچھ دیر بعد کشتی کا سفر بھی اختتام کو پہنچ گیا اور ہم دوبارہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہوگئے ۔لیکن اب خاصی مشکل پیش آئی کیونکہ بارش کی وجہ سے کچے راستے اکثر خراب ہو جاتے ہیں اور گاؤں میں پکّی سڑکیں محدود ہوتی ہیں بہرحال گاڑی آہستہ آہستہ رواں دواں رہی۔اس مشکل کے باوجود موسم کے مسحور کن اثرات دل ودماغ کو معطر کر رہے تھے۔

تقریباً ۲۰ منٹ کے بعد ہم ایک اور نہر کے کنارے پہنچ گئے۔ اگرچہ منظر یہاں بھی بڑا دلفریب تھا کہ گلاب کے پھولوں کی پتیوں پر ٹھہرا ہوا پانی ایسا لگ رہا تھا گویا وضو کیا ہو اور بلبل کی خوب صورت آواز ایسے تھی جیسے اذان ہو، ہر چیز تسبیح بیان کرتی محسوس ہوئی۔لیکن گذشتہ نہر کی بہ نسبت یہ نہر لوگوں کی بے احتیاطی کی وجہ سے شکوہ کناں اور توجہ کی طالب نظر آئی۔

بالآخر یہ حسین اور پر لطف سفر اختتام کو پہنچ گیا اور ہم اپنی منزل مقصود یعنی پنے عزیز و اقارب کے گھر پہنچ گئے جہاں ہمارا پرجوش استقبال کیا گیا ساتھ بہترین مہمان نوازی بھی کی گئی۔

☆.....☆.....☆

حفاظت کا حصار

پبلک پراپرٹی کا خیال آتے ہی عدم تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ایسا احساس جس میں عزت نفس کا کچھ پاس نہ ہو جس کا کوئی والی وارث نہ ہو۔جو پراپرٹی کسی کی ملکیت ہو اس کے اردگرد چار دیواری بنا کر بورڈ لگا دیا جاتا ہے''یہ پبلک پراپرٹی نہیں ہے''''یہاں کوڑا کرکٹ پھینکنا منع ہے''''یہ پراپرٹی برائے فروخت نہیں ہے۔''

شریف آدمی تو دوسرے کی ملکیت کے بارے غلط سوچ رکھے گا ہی نہیں۔اس سے تو یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی۔جب کسی جگہ اس قسم کی اطلاع والے بورڈ آویزاں ہوں تو برے لوگ بھی اپنی شرارت سے باز رہتے ہیں الا یہ کہ کوئی بدمعاشی میں حد سے گزر جائے۔بورڈ لگانے کی وجہ سے مالک کو شریر لوگوں سے قانونی تحفظ فوری مل جاتا ہے کہ اس نے اپنی ملکیت پہ بری نظر رکھنے والوں کو متنبہ کر رکھا تھا۔

خوب صورت نازک قیمتی چیز کی حفاظت کے لئے اہتمام زیادہ کیا جاتا ہے۔وہ برتن ہوں یا زیوران کی حفاظت اور اہمیت انکی قیمت کے لحاظ سے ہوتی ہے روزانہ استعمال کی کم قیمت چیزوں کو غلاف چڑھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔قیمتی اشیاء کو ہی گرد مٹی اور لوگوں کی گندی بری نظروں سے بچا کر رکھنے کے لئے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔

ہیرے جواہرات کی دوکان پہ گارڈ متعین ہوتے ہیں۔گارڈ کی موجودگی بتاتی ہے کہ یہاں صرف وہی لوگ آسکتے ہیں جو اس کے اہل ہیں۔کھلی دوکانوں اور ریڑھی والوں کو گارڈ رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔قیمتی اہم اشیاء کو قدرت نے غلافوں اور پردوں میں چھپا رکھا ہے۔

جسم کے خوب صورت اہم ضروری حصے کی حفاظت کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے دماغ ہو یا دل دونوں کو چھپا دیا خوب حفاظت سے رکھا۔

اللہ نے جنت جیسی خوب صورت جگہ کے گرد باڑ لگا دی کہ اس جنت کے اہل ہی یہاں تک پہنچ پائیں گے۔خود اللہ نے اپنی ذات کو پردوں میں چھپا لیا کہ وہی اس حسن کا دیدار کر سکے گا جو اس کا اہل ہوگا۔

اللہ الخالق کی دنیا میں سب سے پیاری مخلوق عورت ذات ہے۔اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اپنی پیاری حسین انمول مخلوق کو حفاظت سے رکھے گندی نظروں سے بچائے،عزت نفس کو ٹھیس نہ پہنچنے دے تو بھلا شیطان کیسے برداشت کر سکتا ہے۔امت مسلمہ کی خواتین کو شیطان نے چیلنج دے رکھا ہے کہ وہ اللہ رب العزت کی عطا کی ہوئی عزت وقار محبت شفقت کو قبول کر کے خود کو دنیا و آخرت کی اہم ترین شخصیت بنانا چاہتی ہیں یا پھر شیطان کے نقش قدم پہ چلتے ہوئے راندہ درگاہ ہونا چاہتی ہیں۔

☆.....☆.....☆